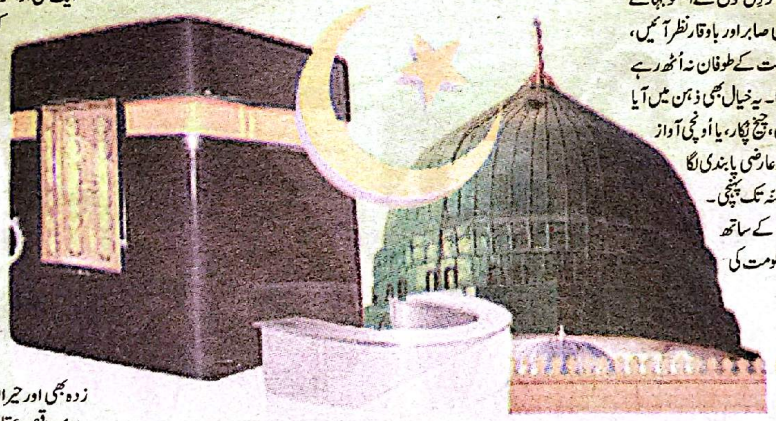
سفرِ محبت.....

حاضریٔ حرمین شریفین کی روداد

ڈاکٹر نوشابہ حسن، لاہور

حرمین شریفین جانے کی تیاری مکمل ہوئی، تو سکھ کا سانس لیا۔ ارادہ یہی تھا کہ خاموشی سے روانہ ہوا جائے، لیکن کچھ انتہائی قریبی افراد کو تو اطلاع دینا ہی تھی، مثلاً قرآن کلاس کے شرکاء، قریبی رشتے دار، گھر کے ملازمین وغیرہ۔ الوداع کہنے والوں کی زبان پر ایک ہی بات تھی کہ ''وہاں جا کے ہمارے لیے بھی دُعا کرنا۔'' اگرچہ، دل میں، ہونٹوں پر بہت سی دعائیں تھیں، مگر جنت میں دیدارِ الٰہی کی خواہش اور اُس کی بے بایاں رحمت کے صدقے بخشش کی التجا، سب سے اہم دُعا ہے۔ بلاشبہ، اللہ مانگنے کو بہت پسند کرتا ہے، بلکہ ہمیں تو یہی ہدایت کی گئی ہے کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے، تو وہ بھی اللہ ہی سے مانگو.... ہم تو اُسی کے دَر کے فقیر ہیں، یہاں بھی اور وہاں بھی۔

مدینہ منورہ..... پہلا پڑاؤ: جب ہم نے حجازِ مقدس کے سفر کا ارادہ کیا، تو پہلا پڑاؤ مدینہ منورہ ہی طے پایا۔ بے شمار دُعائیں، پیاری بیٹی مریم نور کے لیے، جو کہ ہمارے لیے حقیقتاً ''نورِ زندگی'' ہی ثابت ہوئی کہ اُسی کی کاوش سے ہمارے اس پروگرام نے حتمی شکل اختیار کی، جو گزشتہ کئی برسوں سے مؤخر ہو رہا تھا۔ وقتِ روانگی قریب آیا، تو دِل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہو گئیں۔ قسمت پہ رشک بھی آ رہا تھا اور یہ بھی سوچتی کہ کس منہ سے وہاں حاضر ہوں گی؟ لیکن جب مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور وہاں کی معطر فضاؤں نے استقبال کیا، تو پھر نظروں کو بھی یقین آیا اور دِل و دماغ نے بھی قرار پایا کہ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضے تک رسائی کا موقع نصیب ہو رہا ہے۔ کہاں یہ مقامِ مقدس اور کہاں ہم گناہ گار۔ مدینے کی رحمت، ٹھنڈک، امن، سکون، نور کے ہالے میں جیتی جاگتی، اس بستی کا جواب ہی نہیں۔ کوئی ایسے الفاظ نہیں، جو اس منظر کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کر سکیں۔ جذبات کا گویا اِک طوفان، آپ کے باطن میں موجِ زر موج اُبھرتا ہے، مگر اُس کی کوئی لہر چھلکتی نہیں، البتہ، داخلی دنیا کو زیر و زبر ضرور کر کے رکھ دیتی ہے۔ دس، بارہ گھنٹے کے سفر کے بعد، جب ہم لاہور سے مدینہ منورہ پہنچے، تو تھکن کا احساس ایک فطری اَمر تھا۔ لیکن اگر جذبِ شوق اور جوشِ ایمان، زندہ و بے دار ہوں، تو پھر وہ درد کا درماں اور مرہم بن جاتے ہیں۔ جوں ہی مسجدِ نبویؐ کے مینار پر نظر پڑی، تو دِل مچل گیا کہ ابھی روضۂ پاکؐ پر حاضری کے لیے پیش ہونا چاہیے۔ مگر، اگلے ہی لمحے آنکھیں نم ہو گئیں اور سوچتی رہی کہ اپنے وجود کا بوجھ سا کار سا ذیر لے کر کس منہ سے حاضر ہوں گی۔ سعودی حکومت کی طرف سے مرد و خواتین کے حاضری اوقات میں واضح تفریق نظر آئی۔ بعد میں سمجھ آیا کہ خواتین کے لیے صرف عشاء کے بعد 3 گھنٹے کیوں رکھے ہیں؟ مسجدِ نبویؐ میں پاکستانیوں کی تعداد تقریباً 70.60 فی صد نظر آتی ہے۔ زود نے اور حکم بیل کرنے والی خواتین میں پہلا نمبر پاکستان اور دوسرا انڈونیشیا کا ہے، جب کہ سب سے زیادہ مہذب ملائیشین اور پھر ترک ہیں۔ اسی طرح عرب خواتین میں بھی شائستگی ہے۔ مصمّم ارادہ تھا کہ روضۂ رسولِ پاکؐ پر روزانہ حاضر ہو کر سلام پیش کروں گی، مگر دو بار کے بعد، یہ ممکن نظر نہ آیا۔ دھکم پیل اور پھر جگہ پر قبضہ کر کے ریاض الجنۃ میں 20,20 نوافل پڑھنا، انتہائی حیرت ناک اور خود غرضی پر مبنی مناظر تھے۔ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جو خود سراپا صبر و ایثار، تحمل اور نرم خُوئی کا پیکر تھے، جنہوں نے محفل میں بھی کسی نئے شخص کی آمد پر سرک کے جگہ بنانے کی ہدایت فرمائی، اُنہی کی اُمّت کی ان نظم و ضبط سے عاری خواتین کو دیکھ کر دِل خون کے آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکا۔ سیکڑوں کے مجمعے میں صرف چند ایک خواتین ہی صابر اور باوقار نظر آئیں، حالاں کہ ایسا نہیں تھا کہ اُن کے دِلوں میں بھی ملاقات کی چاہت کے طوفان نہ اُٹھ رہے ہوں، لیکن اُنھوں نے اپنے جذبات کو آداب کا پابند کر رکھا تھا۔ یہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ سعودی حکومت کو چاہیے کہ جو خاتون، بے قاعدگی، دھکم پیل، چیخ پکار، یا اُونچی آواز میں بات کرے، اُس پر جرمانہ یا پھر، ایسی خواتین کی حاضری پر عارضی پابندی لگا دی جائے۔ بہر حال، صبر سے باری کا انتظار کیا اور پھر ریاض الجنۃ تک پہنچی۔ معلوم نہیں کس حال میں دو نوافل ادا کیے۔ ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ سلام پیش کیا اور مسلسل دُرود شریف پڑھتی رہی۔ وہاں سعودی حکومت کی طرف سے لکھی آیت، ''جو لوگ رسول اللہ کے حضور بات کرتے اپنی آواز پست رکھتے ہیں، دَر حقیقت یہ وہی لوگ ہیں، جن کے دِلوں کو اللہ نے جانچ لیا ہے، اُن کے لیے مغفرت ہے اور اجرِ عظیم۔'' اسکرین پر مسلسل چلتی دیکھ کر اپنی خواتین کے طرزِ عمل پر ندامت اور شرمندگی محسوس ہوتی رہی۔ ایک عجب روحانی فضا تھی، دِل حاضر تھا اور رُوح مسرور، حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں سلام پیش کیا اور اللہ پاک سے التجا کی کہ یا اللہ! مجھے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم نہ کیجیے گا۔ کیوں کہ اگر خدانہ خواستہ ایسا ہو گیا، تو مَیں کہیں کی بھی نہیں رہوں گی..... اس کے بعد، اپنی والدہ اور بہن کی طرف سے سلام عرض کیا۔ سربراہِ خانہ نے کہا: ''اب یہاں صرف دو دن باقی رہ گئے ہیں، پھر ہم مکّہ مکرمہ چلے جائیں گے تاکہ کم از کم ایک جمعہ تو وہاں مِل جائے۔'' یہ سُنتے ہی دِل دَھک سے رہ گیا۔ ندامت اور کم مائیگی کا احساس شدید تر ہو گیا کہ یا اللہ کتنی کمی رہ گئی، تلاوتِ قرآن اور نوافل میں۔ اس طرح باقی وقت کو غنیمت جان کر قرآن کو اپنی زبان، دِل اور ہاتھوں سے جوڑ کر آنے والے لمحوں کا وظیفہ بنا لیا کہ یہ وہ پاک کلام ہے، جس کا حرف حرف رسولِ کریم ﷺ کے قلب پر نازل کیا گیا۔ دو روز بعد ڈوبتے دِل کے ساتھ سبز گنبد والے کو الوداع کہا۔ اس موقعے پر ہمارے شوہر نام دار نے کیا خُوب بات کہی کہ ''ہم رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یادوں کو ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔'' ایسی قربت کی لذت ایک سچّے عاشقِ رسولؐ اور داعیٔ حق کو مِل جائے، تو دنیا بھر کی نعمتیں اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ ہمیں اس حق کا عَلَم دار ہوتے ہوئے محبتِ رسالتؐ کی اس روشنی کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ الوداع، شہرِ مدینہ الوداع!!



مکّہ مکرمہ روانگی: مدینہ منورہ سے مکّہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوئے، راستے میں مسلسل قرآن اور دُعا کا ساتھ رہا۔ الحمدُ للہ! مسجدِ عائشہ میں نوافل ادا کیے اور احرام کے اہتمام کے ساتھ عُمرے کی نیت کی۔ سفرِ مکّہ بھی انتہائی خوش گوار گزرا۔ راستے بھر سوچتی رہی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکّہ تشریف لے گئے، تو اُنہوں نے عام معافی کا اعلان کر دیا تھا، سوائے گنتی کے چند بدبختوں کے، جن کا جرم ناقابلِ معافی تھا اور پھر، اپنے بارے میں سوچا کہ ایک طرف تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت قائم کرتے ہیں اور بہت ''اللہ والے'' بنتے ہیں، لیکن معاف کرنے میں خاصی دِقت محسوس کرتے ہیں۔ ایسا تضاد اور وہ نسبتِ پاک؟ اس خلیج کا سبب کیا ہے؟ راستے میں اپنی قوم، ملّت، اُمّتِ مُسلمہ کے لیے دعا کی کہ یا اللہ تو ان اجتماعیت کے ستونوں کو راہِ راست دکھا دے۔ اس اُمّت کو باہم جوڑ دے، اور نفسانیت کی جنگ سے نجات عطا فرما دے، کاش یہ اپنے نفس کے بُتوں کو پاش پاش کرنے والے بن جائیں۔

شہرِ جمال (مدینہ منورہ) سے اب ہم شہرِ جلال (مکّہ مکرمہ) پہنچ چکے تھے۔ حرمِ بیت اللہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اگر بہت زیادہ رش نہ ہو تو عُمرہ ایک گھنٹے میں بھی ادا ہو جاتا ہے، لیکن زیادہ رش کی وجہ سے تقریباً 3 گھنٹے لگے۔ پاؤں شل ہو گئے، مگر جوان تو دوڑ دوڑ کر صفا اور مروہ پر جا رہے تھے۔ اپنے بیٹے کو ساتھ دیکھ کر خون جوش مارتا، جو کہ اپنے والدین کو ہدایت دیے جا رہا تھا کہ ''امّی، ابّو آپ سیدھا چلیں'' اور سینستان کر ہمیں چل کر بھی دِکھاتا رہا۔ نیّت تو ایک سے زاید عُمروں کی ہی تھی، لیکن پھر خرابیٔ طبیعت کے باعث ایک ہی ادا کر سکی۔ البتہ شوہر اور بچّے، اُسی طرح وارفتگی کے ساتھ بھاگ بھاگ کر طواف کرتے اور نمازیں ادا کرتے رہے اور مَیں بخار میں تپتی، اُن کو دیکھ کر تڑپتی رہی۔ واپسی کا وقت قریب آ رہا تھا اور اپنی کم زوریوں کا شدید احساس پوری طرح غالب تھا، لیکن رب سے رحمت کی اُمید بھی قائم تھی۔ اس کڑی آزمائش کے لمحوں میں سکونِ قلب کے لیے واحد سہارا دُعا ثابت ہوئی ''میرے مولا! مجھے ایمان کی دولت، صحتِ کاملہ، علم و عمل کے ہتھیار عطا کر۔ میرا تزکیۂ نفس کر دیجیے، سکینت اور نفسِ مطمئنہ عطا کیجیے۔ میرے مالک، شہادتِ حق کا فریضہ ادا کرنے والوں میں میرا، میری اولاد اور ان کی نسلوں کا نام لکھ دیجیے۔ اے اللہ! سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت عطا کیجیے۔'' طوافِ وداع کا لفظ، اتنا سوز و گداز رکھتا ہے کہ سمجھ نہیں آتا کہ اس کو کیسے انگیز کیا جائے؟ ایک خاموش ہیبت و جلال سے بھرپور کعبۃ اللہ کی تصویر ابھی تک نظروں کے سامنے ہے۔ دِل خوف زدہ بھی اور حیران و شاداں بھی! ربِ کعبہ! کیا جاہ و جلال ہے تیرے گھر کا، جو کہ تُو نے ہماری ناقص عقلوں اور تشنگی کے سامان کے لیے بنایا ہے۔ دراصل، تُو تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، مگر یہ گھر ایک علامت ہے، شعائر اللہ ہے، اللہ تو دِلوں میں بستا ہے۔ اے مالک تُو ہمیں کبھی تنہا نہ چھوڑنا۔

محبت کے کئی رنگ اور رُوپ ہیں۔ ماں کی بچّے کے ساتھ، پھر اللہ کی اپنی مخلوق کے ساتھ اور پھر مخلوق کی اللہ کے ساتھ محبت۔ اِس میں یہ تیسری قسم بھی ایک انتہائی خُوب صُورت تعلق کو استوار کرتی ہے۔ یعنی بندے اور رب کا تعلق، اور یہ محبت، ایک انتہائی اَن مول تعلق ہے، جس کا کوئی بدل نہیں، بلکہ لازم و ملزوم ہے۔ جس طرح رب اپنے بندے سے محبت کرتا ہے، اس احساس کو ذرا سا بھی تازہ کر لیا جائے، تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ بندہ اپنے رب کا ناشکرا ہو۔ اُس رب نے تو اپنے بندوں کے لیے پوری کائنات کو مسخر کر دیا۔ کچھ یہی حال، اُس بندے کا ہوتا ہے جو زیارتِ حرمینِ شریفین کے دَوران تھک کے چُور ہو چکا ہوتا ہے۔ پہلے پہل تو وہ بے صبری میں کہہ اُٹھتا ہے کہ اب دوبارہ چلنے کی ہمت نہیں، لیکن یہ سب عارضی باتیں ہوتی ہیں۔ چند ہی دن بعد، بلکہ قیام کے آخری دِنوں ہی میں انسان کہہ اُٹھتا ہے کہ اب مجھے دوبارہ آنا ہو گا اور یہ کہنا، محض کہنا نہیں ہوتا بلکہ پوری محبت، اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ یہ کسک، تشنگی، پیاس اور خلش کبھی بجھتی ہے اور نہ کبھی بجھنی چاہیے، بالکل اِسی طرح جس طرح کسی شمع کی لَو کو اُس کی بقا کے لیے روشن رہنا ضروری ہوتا ہے۔

اختصاریے

خالد حنیف

☆.....رشتوں میں رشتہ یارو یہ دیکھا جاتا ہے رتبہ نہیں۔

☆.....انسانیت بنیادی شے ہے اور دین اس سے اوپر کی۔

☆.....زندگی سے اکتا جاؤ تو اس کی بجائے خواہشات ختم کر کے اسے دوسروں کے نام کر دو۔

☆.....فیصلہ صحیح ہے یا غلط بس اتنا دیکھ لو کہ تم جذبات میں تو نہیں۔

☆.....بے شک پیسہ روکنا برا ہے مگر ہاتھ پھیلانا اس سے بھی برا۔

☆.....حادثے میں میں نے کبھی دوسرے پر اعتراض نہیں کیا کہ آدھی غلطی ہمیشہ میری تھی۔

☆.....خوشبو کو اشتہار کی حاجت نہیں۔

☆.....حرکت کبھی ضائع نہیں جاتی۔

☆.....بندے کے ساتھ کچھ ہو تو سمجھ لو اس نے کچھ کیا ہے۔

☆.....شادی سے پہلے بیٹا ماں کی آنکھ تارا ہوتا ہے مگر شادی کے بعد بیٹی۔

☆.....بے حد بدقسمت، بے وقوف اور بخیل ہے وہ بندہ جو باری تعالیٰ کا شکر تک ادا نہیں کرتا۔

☆.....غیر معروف گناہ میں مبتلا نقصان میں رہتا ہے کہ اس کی توبہ کے امکانات کم رہتے ہیں۔

☆.....چھوٹی چالاکیاں کرنے والے عموماً بڑی حماقتیں کرتے ہیں۔

☆.....میں ایک گھر میں داخل ہوا تو سب لوگ ایک دوسرے کی وجہ سے سر پکڑے بیٹھے تھے۔

☆.....غبارے میں جس قدر تناؤ ہوگا اسے کے پھٹنے کے امکانات اسی قدر زیادہ ہونگے۔

☆.....واقف کار کی تخلیق سے گریزیوں بھی ہوتا ہے کہ مبادا اچھی لگ جائے اور تعریف کرنی پڑے۔

☆.....بندہ بہت اچھا ہوتا ہے جب تک کہ اس سے کام نہ پڑ جائے۔

☆.....کوئی کب عیاشی کرے؟ کہ جوانی میں فرصت نہیں ہوتی اور بڑھاپے میں صحت نہیں۔

☆.....بے وقوف آدمی کی بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ وہ خود کو سب سے زیادہ عقلمند سمجھتا رہتا ہے۔

☆.....خواہشات میں تھوڑی سی کمی کر کے زندگی کو آسان اور زیادتی کر کے پریشان کیا جا سکتا ہے۔

☆.....نظام استوار کرنے کی بنیاد، اشیاء کو اپنے مقام پر رکھنا ہے۔

☆.....حساب دان خیال سے دور اور عمل کے اتنا ہی قریب ہوتا ہے جتنا فلسفی خیال سے قریب اور عمل سے دور ہوتا ہے۔

☆.....جارح کی دفاعی صلاحیت عموماً صفر ہوتی ہے۔

☆.....منتشر خاندان کو اب محبت کا پیمان نہیں، مہنگائی کا طوفان یکجا رکھے گا۔

☆.....دوسرے کا کبوتر تک برداشت نہ کرنے والا بھی یہ چاہتا ہے کہ اس کا پورا مرغی خانہ بمعہ سٹراند و شور کے برداشت کیا جائے۔

☆.....چور کے بچ نکلنے میں اس کی ہوشیاری سے زیادہ قدرت کی ستاری کا ہاتھ ہوتا ہے۔

☆.....جو کسی کی بات برداشت نہ کر سکے۔ خود بھی ایسی بات سے پرہیز کرے۔

قوم.....سورج کی کرنیں.....لیڈر.....محدب عدسہ!

☆.....کام ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے شروع کیا جائے۔

☆.....مجھے یقین ہے کہ میرے بچے بھوکے نہیں مریں گے کہ وہ اللہ کی راہ میں دینے کے عادی ہیں۔

☆.....ہیرے میں ظاہر کے چمکیلے اور اندر کے پتھریلے پن کے سوا اور کیا ہے؟

☆.....حقیقی کامل تو نایاب ہیں۔ اکثر خود غرضی کے ہمرکاب ہیں۔

☆.....محبت.....عام کو خاص بنانے کا نام!

☆.....دلچسپی برقرار رکھنے کو تجسس ایک اہم عنصر ہے جو محبت کی شادی میں مفقود ہو جاتا ہے۔

☆.....مشکل کام چھوڑو.....آسان اپناؤ۔

☆.....آمدنی بڑھانا مشکل ہے.....خرچ کو گھٹاؤ۔

☆.....سب سے بڑھ کر خوبصورتی جوانی ہے.....اگر داغدار نہ ہو۔

افکارِ شاعر



فرخ محمود

ادیبوں اور شاعروں میں اب ''افکار'' کی تخلیق کا رجحان بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ عشق حقیقی ہو یا مجازی، والدین کی محبت ہو یا اولاد سے دل لگی، زندگی اور موت کا فلسفہ ہو یا جینے مرنے کا ڈھنگ۔۔۔ یہ خیالات اب ''افکار'' کی صورت کی میں بھی ''کہے'' جا رہے ہیں۔ گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ، لاہور میں انگریزی ادب کے استاد فرخ محمود کی شاعری کے دو مجموعے ہیشہ سخن اور ''نئی ہے شاعری اپنی'' شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی آنے والی کتاب سے چند ''افکار'' قارئین کی نذر ہیں!

✱ زنانہ لباس کے سکڑنے سے برائی مردانہ وار پھیلتی ہے۔ ✱ جیب کی گرمی حالات کی گرمی سردی سے بچاتی ہے۔ ✱ اصولوں سے لڑنے والے کبھی اصولوں کے لیے نہیں لڑتے۔ ✱ طنز نگار لوگوں پر ہنستا ہے جبکہ مزاح نگار لوگوں کے ساتھ ہنستا ہے۔ ✱ زندگی میں سنگ میل کے لیے میلوں تک سنگ کے سنگ چلنا پڑتا ہے۔ ✱ پڑھائی میں ست بچہ بہانے اور پنسل گھڑنے میں تیز ہوتا ہے۔ ✱ جسم کے گودام میں چربی کی زخیرہ اندوزی سے شخصیت کا بھاؤ گر جاتا ہے۔ ✱ نگینہ طبیعت کے لوگ دوسروں کے دل کو آبگینہ سمجھتے ہیں۔ ✱ تعلقات کی اونچی ایڑی والی جوتی کے پہننے سے اونچا ہونے والا قد مصنوعی ہوتا ہے۔ ✱ ہر سمجھدار بیوی اپنے خاوند کے رفت و آمدن پر گہری نظر رکھتی ہے۔ ✱ شخصیت میں نرگسیت سے پیدا ہونے والی بے نوری کا علاج نرگس کے پاس بھی نہیں۔ ✱ شاعر کثرت آمد کی وجہ سے گھر سے غائب رہتا ہے جبکہ شوہر کثرت آمدن کی وجہ سے گھر سے غائب رہتا ہے۔ ✱ ٹیڑھے معاشرے میں ٹیڑھے منہ سے سیدھی انگلش بولنے والوں کے الٹے کام بھی سیدھے ہوتے ہیں۔ ✱ دوسروں کو اپنے شعر زبردستی سنانے والا کبھی زبردست شاعر نہیں ہوتا۔ ✱ دبلا پتلا ہونے کے لیے ارادے کا موٹا تازہ ہونا ضروری ہے۔ ✱ دوسروں کا خیال رکھنے والے کو ماں کہتے ہیں۔ ✱ اگر خاوند طوطا ہو تو گھر میں بیوی کا طوطی بولتا ہے۔ ✱ زنانہ لباس کی تنگ پوشی کا مردانہ سفید پوشی سے کوئی تعلق نہیں۔ ✱ لہروں کے ساتھ کھیلنے سے بھنور شناسی ملتی ہے۔ ✱ شعلہ رخسار کی گفتگو سننے والے کو سرخرو کرتی ہے۔ ✱ خاوند کو سر کا تاج بنانے والی بیوی گھر کو تاج محل بناتی ہے۔ ✱ زندگی میں کھانے کے لیے دوڑنے والے دوسروں کو کھانے کو دوڑتے ہیں۔ ✱ دل و دماغ کی چربی چرب زبان کی زبان پر آتی ہے۔ ✱ جنس مخالف کو باد مخالف سمجھنے والے آگ سے کھیلتے ہیں۔ ✱ بوڑھا موت سے جبکہ جوان بیماری سے ڈرتا ہے۔ ✱ خود غرض اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے ہر الٹا سیدھا کام کرتا ہے۔ ✱ اس طالب علم کی پڑھائی بیمار ہوتی ہے جو کتابوں کو ایسے دیکھتا ہے جیسے مریض اپنی رپورٹوں کو۔ ✱ پرندے دھوکا کھاتے ہیں اور انسان پرندوں کو کھا جاتا ہے۔ ✱ بانجھ خیالی کی سرزمین بونے اشجار کی نشوونما کے لیے بڑی زرخیز ہوتی ہے۔ ✱ دوسروں کی ناکامیوں کے صحرا میں حسد کا باغ ہرا بھرا رہتا ہے۔ ✱ بڑھاپا ناتوانی کی جوانی کی کہانی ہے۔ ✱ دلیل کی سخاوت گفتگو کی بخیلی ہے جبکہ دلیل کی بخیلی گفتگو کی سخاوت ہے۔ ✱ بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے خواب دیکھتے دیکھتے ماں باپ کے رنگ پیلے ہو جاتے ہیں۔ ✱ حرف کے قطروں کو نقطہ آفرینی کی آب گوہر خیال بناتی ہے۔ ✱ کوشش کی دھول میں کامیابی کے پھول کھلتے ہیں۔ ✱ غریب کے لیے بچے پالنا بھی روگ پالنا ہے۔ ✱ احساس کی دولت رکھنے والے ہی دولت کو دوسروں کے احساس میں خرچ کرتے ہیں۔ ✱ ناشکرا اس بنجر زمین کی طرح ہے جس پر کسی کے احسان کی بارش اثر نہیں کرتی۔ ✱ سوچوں کے تلاطم گہری نظر میں نظر بند ہوتے ہیں۔ ✱ تعریف کا کچھوا تنقیس کا خرگوش ہوتا ہے جبکہ تعریف کا خرگوش تنقیس کا کچھوا ہوتا ہے۔

روزنامہ جنگ / ادبی ایڈیشن / 23/1/2017

نسیم عباسی ہمارے عہد کے ایک بہت محترم اور اہم شاعر ہیں۔ غزل، ان کی جولانگاہ ہے۔ اب تک ان کے تین مجموعے 'نیا آسمان' 'فی الحال' اور کچھ عرصہ قبل 'فلک ہتھیلی پر' سامنے لا چکے ہیں۔ فطرت اور ذات کے مابین ایسے رشتے دریافت کرتے ہیں، جن کی طرف دھیان کم ہی جاتا ہے۔ ہمہ وقت فنافی الشعر دکھائی دیتے ہیں۔ درویش طبع ہیں اور بہت کم گو۔ ان کے ہاں سے انتخاب خاصا مشکل کام ہے، یہاں بس مشتِ ازخروارے ہے۔ تازگی دیدنی ہے:





خواہشِ وصل مری جنس بدلنا چاہے

☆☆☆

مرے وجود کا اب تک خیال رکھا ہے
برتنے والے نے برتن سنبھال رکھا ہے
یہ اور بات کہ ہے ڈور ٹوٹنے والی
کنویں میں ڈول تو پیاسے نے ڈال رکھا ہے
عجیب سمت نمائی سفر میں کی اس نے
مرے جنوب کی جانب شمال رکھا ہے

☆☆☆

جس وقت اس نے بخت ہمارے بنائے تھے
میلی ہتھیلیوں پہ ستارے بنائے تھے
حسبِ مراد دستِ ہنر بولنے لگا
گونگے نے چند ایسے اشارے بنائے ہیں
ہم نے حیا پہن کے محبت شعار کی
گڑیوں کے واسطے بھی غرارے بنائے تھے
دل میں نسیم حسن کی تکفیل کے لیے
آنکھوں نے کیسے کیسے ادارے بنائے تھے

☆☆☆

چاکِ قبا کا مسئلہ جب حل نہیں ہوا
پرچم بنا لیا گیا آنچل نہیں ہوا
چلنا پڑا ہے ہم کو زمانے کے ساتھ ساتھ
تم آج ہو نہیں سکے میں کل نہیں ہوا
یہ اپنی اپنی فکر و نظر کا فریب ہے
پاگل کو بھی یقیں ہے کہ پاگل نہیں ہوا

☆☆☆

کوئی بے یار و مددگار نہیں تھا پہلے
گاؤں بس گاؤں تھا بازار نہیں تھا پہلے
کتنی مضبوط چٹانیں بھی سرک جاتی ہیں
اس جگہ اتنا بڑا غار نہیں تھا پہلے
فرق اتنا ہے کہ میں اس کو خدا سمجھا تھا
مجھ کو جس وہم سے انکار نہیں تھا پہلے

☆☆☆

حصارِ شب میں جب اس نے شگاف ڈالا تھا
تو رنگ و نور کا دریا گزرنے والا تھا
تمام راستہ پرخار تھا تو کیا معلوم
سفر میں آخری کانٹا کہاں نکالا تھا
میں اپنی موت سے پہنچا ہوں اس نتیجے پر
مجھے ضرور کسی دوسرے نے پالا تھا

☆☆☆

وہ جاتے جاتے ایسی نظر ڈال کر گیا
یہ واقعہ خلافِ توقع گزر گیا
بچپن سے اپنے گھر کا پتہ پوچھتا ہوا
مجھ کو نہیں ہے یاد میں کس کس کے گھر گیا

☆☆☆

سروں پہ دھوپ یہ کس رنگ میں کڑی ہوئی ہے
فلک ہی بیٹھ گیا یا زمیں کھڑی ہوئی ہے
پکارتا ہے مدد کے لیے وہاں بھی کوئی
ہر ایک شخص کو اپنی جہاں پڑی ہوئی ہے
مرے ظہور پہ سب نے بہ یک زبان کہا
چراغ چھوٹا سہی روشنی بڑی ہوئی ہے
گماں گزرتا ہے مٹی میں دفن ہیں سائے
یہ شام جیسے درختوں تلے گڑی ہوئی ہے
کسی گنوار نے روی میں بیچ دی تھی نسیم
کتابِ زندگی فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی ہے

☆☆☆

بیج نفرت کے زمینوں میں وہی بوتا ہے
جس نے انسان کو بیلوں کی جگہ جوتا ہے
اپنے دادا کی طرح میں بھی ہوں دادا ابو
اپنے پوتے کی طرح میں بھی کبھی پوتا تھا
جانے کس حال میں وہ شامِ جدائی کاٹے
میں کہ ہر ڈوبتے منظر میں نظر بوتا تھا

☆☆☆

حق بات میں پیمانۂ اظہار نہ دیکھو
جب زہر ہی پینا ہے تو مقدار نہ دیکھو
فطرت کا ہنر اس کے منافی نہیں ہوتا
دیوار کا سایہ سرِ دیوار نہ دیکھو
بینائی سے محروم بھی ہو سکتی ہیں آنکھیں
سورج ہے نسیم اس کو لگاتار نہ دیکھو

☆☆☆

وہیں پہ ہوں میں جہاں سے دکھائی دیتا ہوں
وہیں تلک ہوں جہاں تک مری نظر جائے
عجیب ضد ہے محبت میں اُس کے ساتھ مری
کہ میرے ساتھ جیے میرے ساتھ مر جائے
حدودِ ذات سے آگے خداؤں کی حد ہے
میں سوچتا ہوں اگر ذہن کام کر جائے
ہے کوئی دیر سے اُس پار منتظر میرا
رُکا ہوا ہوں کہ ندّی ذرا اُتر جائے

☆☆☆

ہو بہو تیرے خد و خال میں ڈھلنا چاہے
خواہشِ وصل مری جنس بدلنا چاہے
ایک مُدّت سے مرا ہاتھ ہے بالکل خالی
ہاتھ سے پھر بھی کوئی چیز نکلنا چاہے

☆☆☆

ہر ایک رنگ کا پتھر ترے مکان میں ہے
مگر جو سب سے حسیں تھا ابھی چٹان میں ہے
ہوائے شام کی نیت پہ اعتبار نہ کر
وہ چاک سی لے جو کشتی کے بادبان میں ہے
یہ اُونچ نیچ نظر کا فریب ہے ورنہ
زمیں بھی چاند کی مانند آسمان میں ہے
جو بات گھر میں بھی کرتا ہوں پھیل جاتی ہے
کوئی شگاف یقیناً مرے مکان میں ہے

☆☆☆

میں کوئی فالتو شے اپنے گھر نہیں رکھتا
قلم دوات تو رکھتا ہوں زر نہیں رکھتا
عجب لکیر مسافت میں کھینچ دی اُس نے
کوئی قدم بھی اِدھر سے اُدھر نہیں رکھتا
میں اپنے وقت کے ایسے بلیک ہول میں ہوں
جو روشنی کو رہِ راست پر نہیں رکھتا
ہر ایک پہر اُداسی لیے اُترتا ہے
یہ شہر رونقِ شام و سحر نہیں رکھتا
گزرنے والوں کے اپنے معاملے ہیں نسیم
میں کھڑکیوں سے سڑک پر نظر نہیں رکھتا

مرے سفر میں مرا گھر ابھی نہیں آیا
میں راستے سے پلٹ کر ابھی نہیں آیا
نہ ماپ اتنے تیقّن سے ڈیل ڈول مرا
میں اپنے قد کے برابر ابھی نہیں آیا
شکستہ آئینوں کا دُکھ تجھے نہیں معلوم
تری طرف کوئی پتھر ابھی نہیں آیا
ہے چاند رات ابھی مہرباں سفینوں پر
مزید گہرا سمندر ابھی نہیں آیا
مری سمجھ کے مطابق سبک نہیں اتنا
وہ جسم پانی سے باہر ابھی نہیں آیا

☆☆☆

سفر نصیب کچھ ایسے حدود میں آئے
کہ بے کنار سمندر وجود میں آئے
زمیں کے بس میں وباؤں کی روک تھام نہ تھی
جڑوں کے عارضے پھل کے غدود میں آئے
تری بہشت میں وہ فردِ جرم عائد تھی
ہم آسماں سے زمیں تک سجود میں آئے
عجیب ذوق سے کی اُس نے بزم آرائی
سفید پوش بھی رنگِ نمود میں آئے
نسیم واپسی کا راستہ نہیں ملتا
ہم اِس گلی کی طرف کھیل کود میں آئے

☆☆☆

شکستِ فاش یقینی تھی خود سے لڑتے ہوئے
مگر جما لیے میں نے قدم اکھڑتے ہوئے
غلام عین ضرورت کے وقت حاضر ہو
چراغ جیب میں رکھا گیا رگڑتے ہوئے
مری بساط ہی کیا ایسے موسموں میں تھی
پہاڑ ٹوٹ گئے پھیلتے سکڑتے ہوئے
کہاں وجود میں آتی ہے زندگی یوں ہی
تمام جسم پگھلتا ہے بیج پڑتے ہوئے
نسیم اس نے دیا اوکھلی میں سر اپنا
کسی خیال میں کھوئی تھی دھان چھڑتے ہوئے

☆☆☆

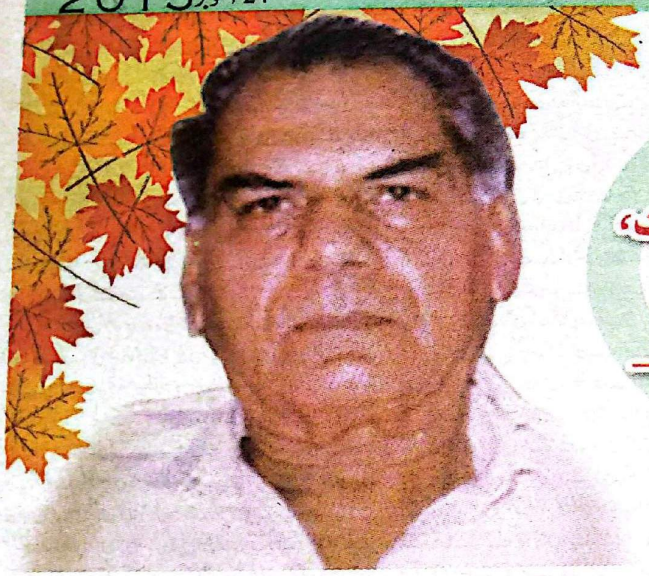
نظر آتی نہیں تھی اُس کی صورت
مگر پانی کے اندر حل وہی تھا
خدا شاہد خدائی سامنے تھی
مگر جو مجھ میں تھا اوجھل وہی تھا

☆☆☆

یہ لب یہ گال یہ آنکھیں مجھے بتاتی ہیں
کہ دل کے سارے مسائل ہی نفسیاتی ہیں
کچھ ایسے ہم نے پس انداز کر لیا خود کو
جوان لڑکیاں جیسے نظر بچاتی ہیں
پکارتا ہے بڑی دیر ڈوبنے والا
پھر اس کے ساتھ صدائیں بھی ڈوب جاتی ہیں

شفیع عقیل مرحوم

لوک کہانیوں، داستانوں کے بیان پر مہارت، تبصرۂ کُتب پر کمال رکھتے تھے



شفیع عقیل (شین۔عین) لگ بھگ دو برس قبل 7 ستمبر 2013ء کو ہمیشہ کے لیے اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ بلاشبہ اردو کے ساتھ پنجابی زبان کے بھی بہترین ادیب، شاعر اور لوک داستانوں کو قلم کی زبان دینے کے ماہر تھے۔ عرصۂ دراز تک روزنامہ، جنگ میں کتب پر تبصرے کرتے رہے۔ انہیں اس فن میں مہارت حاصل ہوگئی تھی اور اس حوالے سے وہ بلند مقام پر فائز تھے۔ ان کا خاندانی نام محمد شفیع اور ادبی نام شفیع عقیل تھا، لیکن انہوں نے شین۔عین ہی کو اپنی پہچان بنالیا تھا۔ وہ 1930ء میں لاہور چھاؤنی کے قریب واقع ایک چھوٹے سے گاؤں ''تھینہ'' میں پیدا ہوئے۔ بتایا جاتا ہے کہ اب یہ گاؤں موجود نہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ابتدائی دَور لاہور کے علاقے، دھرم پورہ میں، جس کا نیا نام مصطفیٰ آباد ہے، گزارا۔ 1950ء میں لاہور سے کراچی تشریف لے آئے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے 1949ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ کراچی میں رہتے ہوئے ان کے پاس یقیناً مزید تعلیم حاصل کرنے کے مواقع تھے، لیکن نہ جانے کیوں مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ البتہ ان کی تحریر کی پختگی اور رچاؤ ایک منجھے ہوئے مصنف کا پتا دیتے ہیں۔

شفیع عقیل مستقل مزاج انسان تھے۔ کراچی آئے، تو کراچی ہی کے ہو رہے۔ صحافت کا پیشہ اختیار کیا، تو صحافی کی حیثیت ہی سے دُنیا سے رخصت ہوئے۔ روزنامہ جنگ سے 1950ء میں وابستہ ہوئے، تو اپنی زندگی کے 64 برس اسی ادارے میں گزار دیے اور اسی ادارے سے منسلک رہتے ہوئے اس دُنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ جنگ گروپ ہی کے تحت ''اخبارِ جہاں'' کے لیے بھی کام کیا۔ جنگ کے میگزین کی ادارت بھی کی۔ رسالہ ''بھائی جان'' اور ہفت روزہ ''ماحول'' کے مدیر بھی رہے اور بھائی جان کے لقب سے خاصے معروف بھی ہوئے۔ مجید لاہوری مرحوم کی زیرِ ادارت نکلنے والے پندرہ روزہ ''نمک دان'' کے نائب مدیر بھی رہے۔ انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز مجید لاہوری اور شوکت تھانوی ہی کے ساتھ کیا تھا۔ مجید لاہور پر دو کتابیں ''مجید لاہوری فن اور شخصیت'' اور ''مجید لاہوری کی حرف و حکایت'' 1971ء میں مرتب کیں۔ شوکت تھانوی پر ان کا ایک مضمون ''ظرافت نگاری کی شان: شوکت تھانوی'' شائع ہوا۔ نیز، وہ آرٹ کے ایک بہترین نقاد کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔

شفیع عقیل کو ان کی ادبی و تصنیفی خدمات پر کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ 1968ء میں ''پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ'' دیا گیا۔ 1976ء میں حبیب ادبی ایوارڈ، 1978ء میں بُک کاؤنسل ادبی ایوارڈ، 1990ء میں خوش حال خان خٹک ایوارڈ اور سرعبدالقادر ایوارڈ، 1995ء میں خدمتِ صحافت ایوارڈ اور 2004ء میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے تمغۂ حسنِ کارکردگی دیا گیا۔ نیز، 2005ء میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اور 2009ء میں کراچی پریس کلب کا نشانِ سپاس دیا گیا، جب کہ اسی برس انہیں لائف ٹائم فیلو اکادمی ادبیات، پاکستان اور کتاب، ''پنجاب رنگ'' پر داؤد ادبی انعام سے بھی نوازا گیا۔

شفیع عقیل مرحوم لوک کہانیوں، لوک داستانوں اور بالخصوص پنجاب کی لوک کہانیوں کے حوالے سے بلند مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے مختلف زبانوں کے ادب، خصوصاً پنجابی ادب کو اردو میں ترجمہ کر کے اردو پڑھنے والوں کو پنجابی ادب سے خوب متعارف کروایا۔ ان کی یہ ادبی خدمت تادیر یاد رکھی جائے گی۔ اس حوالے سے انہوں نے متعدد کتابیں تحریر کیں، جن میں پنجابی لوک کہانیاں، پنجابی لوک داستانیں، پنجاب رنگ، جاپان لوک کہانیاں، ایرانی لوک کہانیاں، چینی لوک کہانیاں، جرمن لوک کہانیاں، جرمن لوک داستانیں، جاپانی لوک حکایتیں، دوستی کا پھل (لوک کہانی)، سوچاں دی زنجیر (1975ء) اور سسّی پنّوں (2002ء) شامل ہیں۔

شفیع عقیل کی تصانیف کی کُل تعداد 37 ہے۔ ان کی اوّلین کتاب 1952ء میں ''بُھوکے'' (افسانے) کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ گویا، انہوں نے تصانیف کی ابتدا افسانوں سے کی۔ اس کے بعد اردو اور پنجابی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی تصانیف میں ''ایک آنسو، ایک تبسّم'' (طنز و مزاح) 1953ء، ''ڈھل گئی رات'' (ناول) 1957ء، ''مجید لاہوری، فن اور شخصیت'' 1957ء، ''تیغِ ستم'' (طنز و مزاح) 1973ء، ''ہماری منزل، غازی یا شہید'' (رپورتاژ) 1974ء، ''پنجاب رنگ 1974ء''، ''غالب، جنھوں ہرکوئی چنگا آکھے (پنجابی ترجمہ) 1979ء''، ''پنجاب کے پانچ قدیم شاعر 1970ء''، ''مجید لاہوری کی حرف و حکایت'' 1973ء، ''سیر و سفر'' 1980ء، ''زہر پیالہ 1980ء''، ''سیف الملوک'' 1990ء، ''تنقید و آگہی'' 1995ء، ''قائدِ اعظم محمد علی جناح، تقریریں تے بیان'' 1997ء، ''نام ور ادیبوں اور شاعروں کا بچپن'' 1998ء، ''نام ور ادیبوں کی نایاب کہانیاں اور ڈرامے'' 1998ء، ''نام ور شاعروں کی نایاب منظومات 1999ء''، ''نام ور ادیبوں اور شاعروں کے نایاب مضامین'' 2002ء، ''ادیب اور ادبی مکالمے 2002ء''، ''دو مصوّر بشیر مرزا اور آزر زوبی'' 2003ء، ''مشہور اہلِ قلم کی گم نام تحریریں'' 2004ء، ''پیرس تو پھر پیرس ہے'' 2004ء، ''سلطان باہو: حیات و فن'' 2004ء، ''زندگی پھر کہاں، چھے ممالک کا سفر نامہ'' 2009ء، ''سُرخ، سفید، سیاہ'' 2009ء، ''سفر نامہ مغربی جرمنی''، ''چار جدید مصوّر''، ''تصویر اور مصوّر'' اور دیگر شامل ہیں۔ شفیع عقیل کو یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ ان کی کتاب ''پنجابی لوک کہانیاں'' یونیسکو کی جانب سے سات زبانوں میں شائع ہوئی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے ان کی کتاب ''پنجاب رنگ'' پر انہیں داؤد ادبی انعام سے نوازا گیا۔



شفیع عقیل کتابوں پر تبصرے کے حوالے سے زیادہ شہرت رکھتے تھے اور روزنامہ جنگ میں ''شین عین'' کے نام سے ہر ہفتے کئی کتب پر ان کے تبصرے شائع ہونا اس کی بنیادی وجہ تھی۔ یہ تبصرے اپنے معنی اور وسعت کے اعتبار سے بہت اہمیت کے حامل تھے۔ تبصرہ پڑھ کر قاری کتاب کے بارے میں بڑی حد تک اندازہ کر لیتا کہ اس میں کیا کچھ موجود ہے۔ ایک مغربی مفکّر نے تبصرے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ ''تبصرہ دراصل دستاویزیا کتاب کے متن کو مختصر اور صحیح طور پر اس انداز سے بیان کرنے کا فن ہے کہ وہ اصل دستاویز معلوم ہو۔'' گویا تبصرہ اصل دستاویز کا نچوڑ یا حاصل ہوتا ہے اور شفیع عقیل مرحوم اس فن سے بہ خوبی آگاہ تھے، بلکہ انہوں نے تو اس فن میں گویا

ڈاکٹر رئیس صمدانی

کمال حاصل کر رکھا تھا۔ ان کے لکھے ہوئے تبصرے پڑھنے اور تحقیق کرنے والوں کے لیے معاون ثابت ہوتے۔ شفیع عقیل نے علمی و ادبی خدمت کے جو چراغ اپنے خون، پسینے سے روشن کیے، وہ ہمیشہ روشن رہیں گے۔ پانچ دریاؤں کی سرزمین پر طلوع ہونے والا یہ ستارہ 83 برس اپنی آب و تاب دکھا کر کراچی شہر کی مٹی میں 7 ستمبر 2013ء بروز جمعہ ہمیشہ کے لیے پیوندِ خاک ہو گیا۔ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

رنگا رنگ

سہیل احمد صدیقی

13 سالہ صاحب دیوان شاعر

اعجاز حسن صادق پوری، جو نوعمری ہی میں دنیا چھوڑ گیا

برسوں قیام کے لیے آیا نہیں ہوں میں

اگر آپ سے پوچھا جائے کہ آیا کوئی محض تیرہ چودہ برس کی عمر میں مستند سخن ور ہو سکتا ہے تو آپ یقیناً سوال کرنے والے شخص کی ذہنی کیفیت پر شک کریں گے۔ یہاں قافیہ پیمائی کی بات نہیں ہو رہی، تغزل سے بھرپور، معرفت کی نکتہ داں، زندگی کی بے ثباتی پر مجمل تبصرے کی حامل اردو شاعری کا ذکر ہے۔

اردو کے سب سے کم عمر صاحب دیوان شاعر کا نام اعجاز حسن، تاریخ پیدائش 16-3-1967 بمقام کراچی (پاکستان) اور تاریخ وفات 10 دسمبر 80-12-10 مقام کراچی ہے۔ اس حساب سے وفات کے وقت اس کی عمر بمشکل تیرہ سال کے قریب تھی۔ اس کا مجموعہ کلام بعنوان "نقشِ اعجاز" اس کی وفات کے بعد اکتوبر 1981ء میں اس کے والد سید احمد حسن ایم اے (علیگ) نے شائع کیا۔

اس مجموعۂ کلام کے پیش لفظ میں صاحب کلام کے دل گرفتہ والد لکھتے ہیں "ایک دس بارہ سال کے لڑکے کی زبان سے حسن و عشق اور بادہ و جام کی روش سے ہٹ کر فلسفیانہ اور عارفانہ کلام کا موزوں ہونا عقل میں آنے والی بات نہیں۔ یہ محض شان کریمی ہے کہ اعجاز حسن نے اپنی مختصر زندگی میں اتنا کچھ کہا کہ آج آپ کے سامنے ان کا یہ شعری مجموعہ "نقشِ اعجاز" کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔"

کسی شاعر نے گویا کم عمر اہل قبور کے لیے کہا تھا

یہ پھول اپنی لطافت کی داد پا نہ سکا
کھلا ضرور مگر کھل کے مسکرا نہ سکا

کسی تحریر کو پڑھ آپ کا دل بھر آئے تو یہ دلیل ہے اس امر کی کہ نہ صرف لکھنے والا خون جگر صرف کر کے کوئی مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا، بلکہ پڑھنے والا بھی خود کو زندہ ذی شعور اور حساس سمجھ سکتا ہے!

اعجاز کا نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے اور خدا لگتی کہیے کہ ایسا سوز و گداز عصر حاضر کے کتنے پختہ سخن وروں کو نصیب ہوا

دم میں دم آئے تو پوچھوں اک بات

کیا ہوئی رات سہانی میری
کوئی سمجھے بھی تو کیوں کر سمجھے
ہائے آشفتہ بیانی میری
یوں نہ پیراہن ہستی کر چاک
زندگی گرچہ ہے فانی میری
ہے مرے دم سے یہ دنیا آباد
میں نہیں ہوں تو کہانی میری

.....

جو مٹا دے اس جہاں سے رنج و غم
ایسا طوفاں کوئی برپا کر چلو
ہاں یہ دنیا ایک تماشا گاہ ہے
تم بھی تو کوئی تماشا کر چلو
لاکھ ہو اعجاز یہ دنیا بُری
تم اگر اچھے ہو اچھا کر چلو

.....

ابھی معلوم نہیں جینے کے آداب مجھے
ورنہ یہ قلزم ہستی بھی ہو پایاب مجھے
چند روزہ ہے مرے گلشن ہستی کی بہار
پھر نہ دیکھو گے یہاں تم کبھی شاداب مجھے
ساحل بحر تخیل پہ کھڑا ہوں صد حیف
غرق ہونے ہی سے ملتا دُر نایاب مجھے

.....

خوشا یہ زخم جگر اور یہ اشکبار آنکھیں
یہ فصل لالہ و جوئے رواں رہے نہ رہے

ہم نشیں اب کے تقاضائے جنوں ہے کچھ اور
اب یہ سر ہو کہ نہ ہو اور کوئی در ہو کہ نہ ہو

.....

آہ سے گریہ بادل بنا
اور بادل ہوا ہوگیا

.....

مثل حباب تابع دریا نہیں ہوں میں
دنیا میں رہ کے طالب دنیا نہیں ہوں میں
دیکھو مجھے کہ میں بھی ہوں تصویر آب و گل
اک درس زندگی ہوں تماشا نہیں ہوں میں

اعجاز نے جا بجا میر سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اس کے بعض اشعار پر میر کا اثر نمایاں ہے، مگر ساتھ ساتھ آپ اس کے طفیل درد، غالب، اصغر گونڈوی، سیماب اکبر آبادی اور اقبال کے لاشعوری اکتساب سے بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے یاد آیا کہ اس کمسن شاعر نے کہیں بالواسطہ تو کہیں بلاواسطہ اپنی جلد وفات کی پیش گوئی بھی کی ہے، جس کا ایک واضح نمونہ یہ ہے

اب کوئی دم کی دیر ہے اعجاز کوچ میں
برسوں قیام کے لیے آیا نہیں ہوں میں

.....

یاسیت نگاری میں اعجاز کے متعدد اشعار، نظمیں اور غزلیں فانی بدایونی کے رنگ میں رنگی محسوس ہوتی ہیں، مگر یہاں اقبال کے رنگ سخن میں کلام اعجاز کا نمونہ بلا تبصرہ پیش خدمت ہے

میں فریب خوردۂ راز ہوں
نہ میں سوز ہوں نہ میں ساز ہوں
نہ میں ناز ہوں نہ نیاز ہوں
نہ میں غزنوی نہ ایاز ہوں
مری ابتدا ہے نہ انتہا
نہ نشیب ہوں نہ فراز ہوں
میں ہوں اک حقیقت بے کراں
گو شریک بزم مجاز ہوں
دم نے میں گو ہے نوا مری
نہ میں نے نہ نغمہ نواز ہوں
نہ طویل ہے مری داستاں
نہ ربینِ عمر دراز ہوں
مجھے دو نہ طعنۂ بے کسی
میں گدائے بندہ نواز ہوں
مری خاک اڑتی ہے کو بہ کو
میں غبارِ کوئے حجاز ہوں

.....

اعجاز کے کلام میں تشبیہہ، استعارہ، کنایہ، تلمیح سمیت مختلف صنائع کی تلاش آسان ہے، نیز لفظیات کی انفرادیت اور لہجے کی تازگی وہ چیدہ چیدہ خصوصیات ہیں جن پر نظر ڈالیں تو یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ واقعی کسی ایسے پختہ سخن ور کا کلام ہے جسے تلمیذ الرحمٰن کہنا بجا ہوگا۔ شبلی نعمانی کی شاعری ان کی علمیت، تحقیق، تنقید اور تاریخ نویسی کی شہرت کے آگے ماند پڑی تو کسی نے کہا تھا کہ یہ خود رو پودے کی مانند ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اعجاز حسن صادق پوری صحیح معنوں میں وہ خود رو پودا تھا جسے موت کی بے رحم آندھی نے جلد اکھاڑ پھینکا اور اس کے لواحقین کسی ادبی وڈیرے سے تعلق نہ ہونے کے سبب اس کی شعری عظمت کو یوں اجاگر نہ کر سکے جیسا آج بہت سے متشاعر اور متشاعرات بہ آسانی کر سکتے ہیں اور کر چکے ہیں۔

اعجاز نے طویل، درمیانی اور مختصر ہر طرح کی بحور میں غزل کہی۔ نظم اور ترانہ نگاری میں بعض جگہ موقع کی مناسبت سے سہل زبان استعمال کی۔ اس کا کہا ہوا بعض کلام اس قابل ہے کہ اسکول کی نصابی کتب میں شامل کیا جائے۔ اعجاز کا نظم کیا ہوا قومی نغمہ ملاحظہ کیجیے

تن من دھن اور جان سے پیارا
پاکستان ہمارا
اس کی عزت اپنی عزت
ہے ایمان ہمارا
اس کی خاطر ہم ہیں زندہ
اس کے لیے ہے جاں بھی حاضر
آنچ نہ آنے دیں گے اس پر
ہے پیمان ہمارا
جب تک چاند ستاروں سے
یہ دھرتی جگ مگ کرتی ہو
پاکستان رہے دنیا میں
ہے ارمان ہمارا
اس پر مصیبت آن پڑی ہے
اٹھو جاگو، ہوش کرو
راہ وفا میں مرنے والو
جام شہادت نوش کرو
تن من دھن اور جان سے پیارا
پاکستان ہمارا

اعجاز کے نظریہ کلام میں جوش، پند و نصائح اور روایتی یاسیت نگاری کے ساتھ ساتھ تغزل بھی حیرت انگیز طور پر موجود ہے، جب کہ غزلیہ کلام میں مجازی رنگ مفقود اور حقیقی رنگ قدرے فارسی آمیز اور غالب ہے۔ بلاشبہ بعض جگہ فارسی کے "تصوف گو" شعراء کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اعجاز حسن صادق پوری کو اس کی زندگی ہی میں بزرگوں کے نزدیک، احترام، تکریم، اور تعظیم حاصل تھی۔ اسے مختلف متنوع اور پیچیدہ موضوعات کے ساتھ ساتھ مختلف زبانیں سیکھنے کا شوق تھا۔ یہاں یہ ممکن نہیں کہ وہ واقعات بھی نقل کیے جائیں جن سے اعجاز کا جینئس ہونا ثابت ہوتا ہے، مگر "نقشِ اعجاز" کا مطالعہ جید نقادانِ فن کو بھی سنسنی خیز مضمون لکھنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

کم کہنا، خود کہنا اور اچھا کہنا آج بھی بہت سے مشہور شاعروں کے لیے چیلنج ہے۔ راقم بخوبی جانتا ہے کہ کس طرح کئی عشروں سے طبع آزمائی کرنے والے جب مشاعرے میں غزل سرا ہوتے ہیں تو ہم ایسے خوردبیں بھی بعض اوقات بے ساختہ ہنسنے یا چہ می گوئی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں کلام اعجاز واقعی "اعجاز" ہے۔ ■

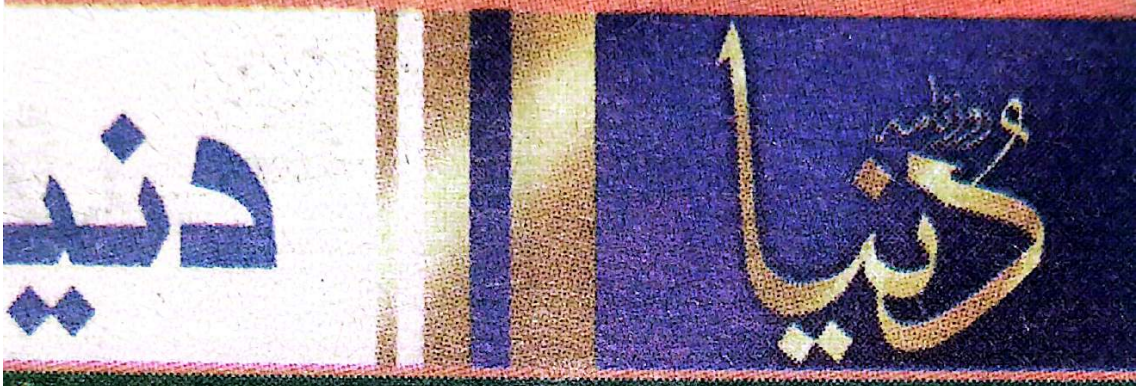
بھاویں کُجھ وی کول نہیں ہوندا ہتھاں وِچ کشکول نہیں ہوندا
لکھاں ٹُھڈے کھانے پیندے وٹّا اینویں گول نہیں ہوندا
یوسف ورگے وِکدے ویکھے بندہ کوئی انمول نہیں ہوندا
پنج دریا وی سُکے پئے نیں کُوہ تے جاواں ڈھول نہیں ہوندا
اوہدے نال میں گلاں کرناں جِس ویلے اوہ کول نہیں ہوندا
[illegible]رے مُل نہیں پُورا لبھدا کِدھرے پُورا تول نہیں ہوندا
ہر اِک گل دی کراں منادی میرے گل چ ڈھول نہیں ہوندا
پاگل مُشکلاں وی نہ جانے اینا وی انبھول نہیں ہوندا
نظراں نال اوہ بندے مارے ہتھاں وِچ پستول نہیں ہوندا
پہلاں کِدھرے ہس لیندے ساں ہُن تے کدی مخول نہیں ہوندا
شر نُوں شر تے کہندا اے پر بُلاں تے لاحَول نہیں ہوندا
سولاں آنے سچ کہنا واں میری گل چ جھول نہیں ہوندا
جتھوں تُرکی لبھدا پھرناں اوہ تے استنبول نہیں ہوندا
اوہ جاوید جے آ جاوے تے فیر میں ڈانواں ڈول نہیں ہوندا

❖

تخلیق کا جب اس نے فسانہ لکھا
ہر چیز کا کیا ہوگا ٹھکانہ لکھا
بستے کے مقدر میں لکھا بھاری پن
اور میرے مقدر میں اٹھانا لکھا

13/8/17

سنڈے میگزین



عجب مقام سجھاتی ہے نعتِ پاک حضورؐ

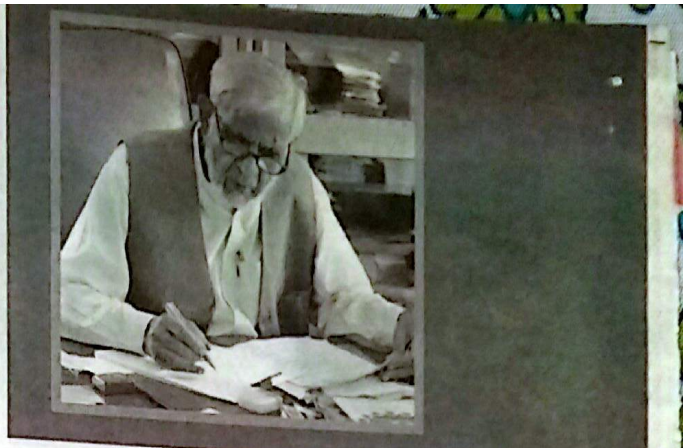
حفیظ تائب

عجب مقام سجھاتی ہے نعتِ پاک حضورؐ
کہاں کہاں لیے جاتی ہے نعتِ پاک حضورؐ

کبھی خیال سرِ عرش جا پہنچتا ہے
کبھی حرم میں بٹھاتی ہے نعتِ پاک حضورؐ

وضو سے جو کرتے ہیں اشکوں سے میرے لفظ و خیال
تو پھر وجود میں آتی ہے نعتِ پاک حضورؐ

حصارِ نور میں رکھتی ہے ہر گھڑی تائب
سیاہیوں سے بچاتی ہے نعتِ پاک حضورؐ



سید بابر علی
عکاسی: اشرف میمن

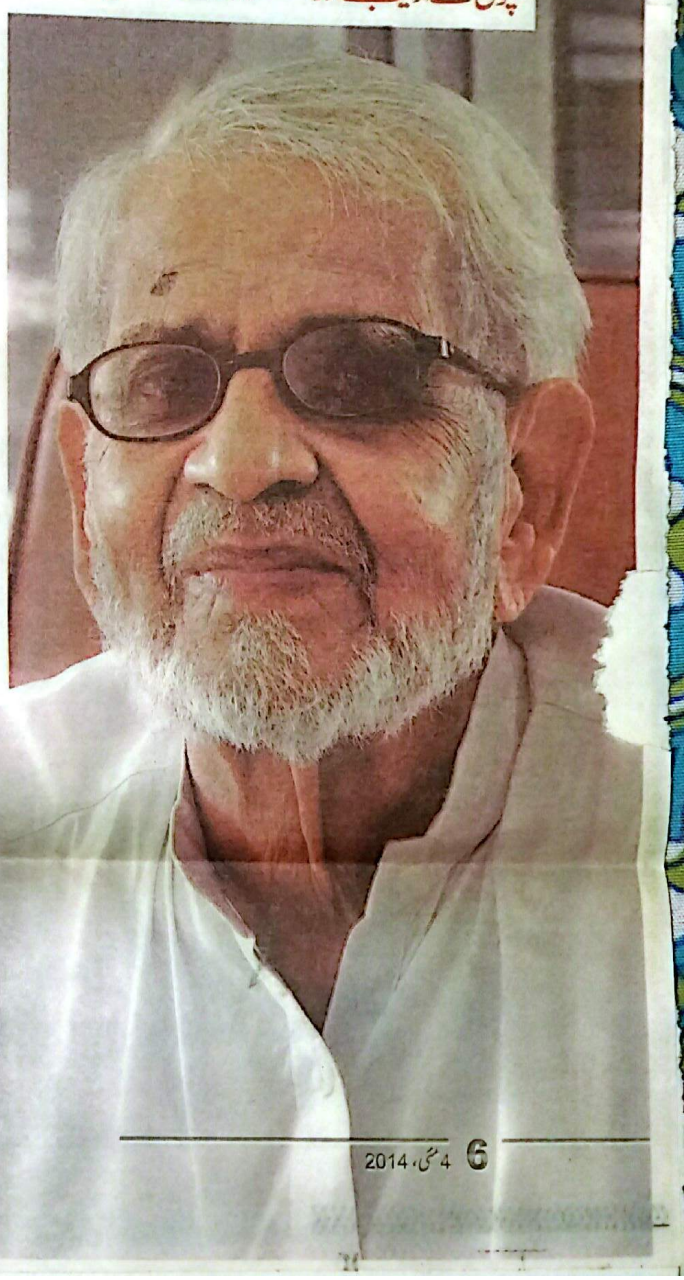
بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے یا لکھنے کے عمل کو ہمارے ہاں عمومی طور پر کارِ زیاں سمجھا جاتا ہے، لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے نصف سے زائد عرصہ اس کی چراغوں سے منور کرنے کے لیے پوری عرق ریزی کی۔ پاکستان کے ایسے قلم کاروں میں مسعود احمد برکاتی سرفہرست ہیں، جو گزشتہ چھے دہائیوں سے نونہالوں کا مستقبل سنوارنے کی جُہد و دھن میں مصروف ہیں۔ یہ سادہ مزاج، وضع دار اور کم گو تخلیق کار نسلوں کی آب یاری کا ذمہ کاندھوں پر لیے، اپنے نوکِ قلم سے علمی جہاد میں مصروف ہے۔ اگر اُن کی خدمات کا تخمینہ لگایا جائے، اعداد و شمار کے عدسے سے جائزہ لیا جائے، اور حقیقی کلیوں کا اطلاق کیا جائے تو برکاتی صاحب کا سیدز نشان سپاس سے بھر جائے گا۔ یہ طویل دیر "ہمدرد نونہال" کے ذریعے بچوں کی تہذیبی، اخلاقی اور لسانی تربیت اور انھیں ایک اچھا شہری بنانے کی سعی مسلسل کے حوالے سے ان کا نام سنہری حروف میں لکھا جانا چاہیے، تاہم یہ فقیر منش، درویش صفت شخص، ماضی کی طرح آج بھی ستائش سے بے نیاز نظر آتا ہے۔

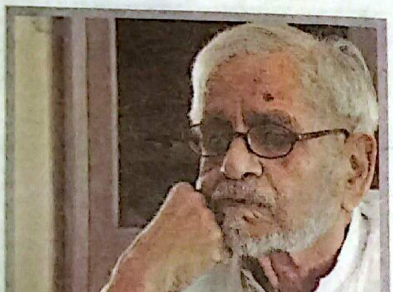
مسعود احمد برکاتی کو 1996 میں اے پی این ایس کی جانب سے پاکستان کے "سینیر ترین پروفیشنل ایڈیٹر" کا نشانِ سپاس دیا گیا۔ ان کی چھے دہائیوں پر پھیلی خدمات، افکار اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جاننے کے لیے ہم نے ان کے ساتھ ایک نشست کی، جس کی تفصیل قارئین کے لیے پیش ہے۔

.....

ایکسپریس: پاکستان میں بچوں کے ادب کا مستقبل کیا دیکھتے ہیں؟

مسعود احمد برکاتی: پاکستان میں بچوں کے ادب کا مستقبل تاب ناک نہیں بلکہ غیر یقینی ہے۔ کئی اسباب ہیں جو نا امید کرتے ہیں۔ ہمارے حکم رانوں کو ذرا احساس نہیں ہے۔ حکم رانوں میں وہ دانش ور اور اہلِ قلم اور ایسے اداروں کے سربراہ بھی شامل ہیں جو علم و ادب اور قومی زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے ہی قائم کیے گئے ہیں، اُن کو بھی ذرا احساس نہیں ہے۔ بچوں کے لیے لکھنے والوں کی قدر نہیں کی گئی تو آئندہ بچوں کے لیے لکھنے والے کیسے پیدا ہوں گے۔ آپ بتائیے کہ آج تک بچوں کے لیے سال بہ سال سے لکھنے والے کسی ادیب کو کوئی اعزاز دیا گیا، جب کہ بچپن میں بچوں کے رسائل اور تحریریں پڑھنے والوں میں نواز شریف صاحب اور کئی وزرائے اعظم بھی شامل ہیں۔ کئی بڑی جماعتوں کے سربراہ





ایکسپریس: بچوں کے ادیبوں کو حکومتی سطح پر پذیرائی نہ ملنے کا سبب کیا ہے؟

مسعود احمد برکاتی: بچوں کے ادیبوں کو حکومتی سطح پر پذیرائی نہ ملنے کی وجہ قوم کے مستقبل سے بے پروا ہو کر حکم رانوں کا وقتی مسائل میں کھو جانا ہے۔ بچوں کے ادیبوں کو عملاً ادیب ہی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ آج تک بچوں کے کسی ادیب کو کوئی بڑا ایوارڈ نہیں دیا گیا۔ بچوں کے کسی ادیب کو صدر یا وزیر اعظم کے ساتھ بیرونی دوروں پر نہیں لے جایا جاتا۔ بچوں کے لیے لکھنے والوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، البتہ ان ادیبوں کی تحریریں پڑھنے والے قارئین اپنی محبت سے اس بے نیازی کی بڑی حد تک تلافی کر دیتے ہیں۔ مطالعے کے رجحان میں آنے والی کمی اور الیکٹرانک میڈیا کا زور بھی لوگوں کو کتابوں سے دور کر رہا ہے۔ عام طور سے ادیبوں کو اُن کی تخلیقات کا معاوضہ نہیں ملتا، حکومت ایسی تدابیر اختیار کرے، جس سے قلم کاروں کو معاوضہ ملنے کی صورت نکلے۔ اپنی کتابیں خود شایع کرنے والے ادیبوں کو رعایتی نرخ پر کاغذ مہیا کیا جائے۔ حکومت علمی، ادبی اور بچوں کے رسائل کو قطع نظر اُن کی تعداد اشاعت کے، زیادہ سے زیادہ اشتہارات دے۔ ادیبوں، شاعروں اور بچوں کے ادیبوں کو مختلف ایوارڈز دیے جائیں۔

ایکسپریس: ہمدرد کے ساتھ چھے دہائیوں پر محیط سفر طے کرنے کے بعد خود کو کہاں دیکھتے ہیں؟

مسعود احمد برکاتی: ہمدرد کے ساتھ چھے سے زاید دہائیوں تک علمی، ادبی فلاحی اور سماجی خدمات انجام دینے سے مجھے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی ضایع ہونے نہیں دی اور کوشش کی کہ اپنی بہترین ذہنی اور علمی صلاحیتوں سے شہید حکیم محمد سعید کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل میں حصہ لوں اور یکسوئی کے ساتھ اپنے قلم کی طاقت کو تعمیرِ ملت اور فروغِ علم و اخلاق میں صرف کروں۔ الحمدللہ میں ناکام نہیں رہا۔

ایکسپریس: دوسرے اخبارات یا رسائل کے لیے کام کرنے میں کیا رکاوٹ حائل رہی؟

مسعود احمد برکاتی: دوسرے رسائل و اخبارات کے لیے ناکام کرنے میں ہمدرد کی خدمات یکسوئی سے کرنے کا سبب بھی ہے، لیکن نکتہ صد تک میں نے صحافی دوستوں سے تعاون کیا ہے۔

ایکسپریس: ادب کی طرف لگاؤ گھریلو ماحول کی وجہ سے ہے؟

مسعود احمد برکاتی: ادب سے لگاؤ خاندان سے ورثے میں ملا ہے۔ ہمارے گھر وسیع و عریض تھے۔ گھر میں والد، دادا کی لائبریری تھی جس میں مجموعی طور پر ہزاروں کتابیں تھیں، جن میں زیادہ تر کتابیں قدیم موضوعات خصوصاً دین، فلسفہ اور تاریخ پر تھیں، لیکن ادبی موضوعات پر بھی جدید ادیبوں کی تصانیف تھیں۔ میں اس وقت صرف مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ "الہلال" کا ذکر کروں گا، جو میں نے بہت نوعمری میں پڑھا اور مولانا آزاد کی مشکل زبان کے باوجود میرے ذہن پر ان کا "لہجہ" اور انداز بیان چھا گیا۔ کچھ ہی برسوں کے بعد یاد ہو گئے۔ بہرحال میں نے تنہائیوں کے ماحول میں ذہنی خوراک پائی۔

ایکسپریس: آپ کہاں پیدا ہوئے؟ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیے۔

مسعود احمد برکاتی: میری تاریخ پیدائش 10 اگست 1933 لکھی جاتی ہے، لیکن صحیح نہیں ہے۔ اصلی تاریخ مجھے یاد نہیں، لیکن وہ اس سے چند سال پہلے کی ہے۔ معلوم نہیں یہ غلط تاریخ کیسے عام ہو گئی۔ میں ریاست ٹونک (راجستھان) میں پیدا ہوا۔ میں اپنے خاندان کا پہلا فرد ہوں جس نے انگریزی سیکھی اور پڑھی۔ میری والدہ محترمہ بشیر النساء بیگم کی یہ دور بینی اور بصیرت تھی کہ انھوں نے مولویوں کی شدید مخالفت کے باوجود گھر پر استاد (ٹیوٹر) رکھ کر انگریزی پڑھوائی۔ اس وقت ہمارے خاندان میں دینی تعلیم ضروری تھی۔ عربی، فارسی ضروری تھی۔ جاگیردار گھرانا ہونے کی وجہ سے تعلیم صرف علم کے لیے دی جاتی تھی۔ کسی سند کی ضرورت اور اہمیت نہیں تھی، لیکن علم میں گہرائی اور وسعت ہونی ضروری تھی۔ کھیل کود تھا مگر بہت کم، میں نے کرکٹ کھیلی مگر زیادہ دن نہیں۔

ایکسپریس: ٹونک سے وابستہ کچھ یادیں ہمارے قارئین سے شیئر کریں۔

مسعود احمد برکاتی: ٹونک کے بارے میں بتانے کے لیے تو وقت چاہیے۔ ٹونک صوبہ راجستھان کی اٹھارہ ریاستوں میں سے واحد مسلمان ریاست تھی۔ پڑوس میں ریاست ہے پور اور شہر اجمیر تھا، جو خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ اجمیر کوئی ریاست نہیں تھا، بلکہ مرکزی حکومت ہند کے تحت تھا۔ خواجہ صاحب کا عرس ہوتا ہے تو پورے ملک سے لوگ آتے ہیں اور مہینہ بھر بڑی گہما گہمی رہتی ہے۔ ٹونک بڑا علم و عالم دوست شہر تھا۔ وہاں شعر و شاعری کا بہت چرچا تھا۔ شعرا کی کثرت اور بڑی قدر تھی۔ میرے بڑے بھائی مولانا حکیم محمود برکاتی شہید بہت اچھے شاعر تھے۔ اسی طرح حفظ قرآن کی تعلیم تھی۔ ٹونک کا ہر تیسرا آدمی حافظ قرآن تھا۔ میرے دادا علامہ حکیم سید برکات احمد صاحب بہت بڑے عالم اور طبیب تھے۔ ہندوستان سے باہر اسلامی ملکوں کے طالب علم ان سے استفادہ کرنے آتے تھے۔ ان کے قائم کردہ "دارالعلوم ظلیہ" میں بھی کئی اہم علما درس دیتے تھے۔ ہزاروں طلبہ تھے۔ ان کی وجہ سے شہر کا ماحول دینی اور علمی تھا۔ مختصر یہ کہ ٹونک صنعتی اور تجارتی نہیں بلکہ علم دوست شہر تھا۔ زیادہ پیسے والے لوگ بھی نہیں رہتے تھے۔

ایکسپریس: اب تک کتنی کتابیں اور سفرنامے لکھ چکے ہیں؟

مسعود احمد برکاتی: اب تک لکھا تو بہت ہے۔ بڑوں کے لیے لکھنا شروع کیا تھا۔ نفسیاتی مضامین لکھے۔ متفرق موضوعات پر بھی لکھا، 1951 میں ماہنامہ "معاشیات" کراچی میں "اشتراکیت"، "کارل مارکس"، "تاریخ کی مادی تعبیر"، "طبقاتی نزاع"، "اشتراکیت" اور "مذہب" کے عنوانات سے علمی اور غیر سیاسی مضامین لکھے۔ رسالہ "معاشیات" بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو، پاکستان سے جاری کیا تھا۔ جناب محمد احمد سبزواری اس کے ایڈیٹر تھے۔

پاکستان میں بچوں کے ادب کا مستقبل غیر یقینی ہے

کتاب کی اہمیت ہے اور باقی رہے گی، نونہالوں کے ادیب کو ادیب تسلیم ہی نہیں کیا جاتا

بچوں کے ادیب اور معروف دانش ور مسعود احمد برکاتی سے خصوصی انٹرویو

انٹرویو



1953 میں شہید حکیم محمد سعید نے بچوں کا ماہنامہ ہمدرد نونہال میرے سپرد کیا۔ مجھے بچوں کے لیے لکھتا پڑا۔ مسلسل 62 سال سے بچوں کے لیے لکھ رہا ہوں۔ ہر سال اس کا ایک ضخیم خاص نمبر نکالتا ہوں۔ حکیم صاحب بچوں کے مستقبل کو قوم کا مستقبل سمجھتے تھے اور ہمدرد نونہال کی ترقی اور صحت کے لیے ہر ممکن چیز اور تدبیر سے خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ حکیم صاحب کی شہادت کو 15 سال سے زاید کا عرصہ ہوگیا ہے۔ اللہ کی مشیت سے ہمدرد نونہال اسی باقاعدگی اور پابندی سے نکل رہا ہے۔ محترمہ سعدیہ راشد (صدر ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان) بھی حکیم صاحب کی طرح دل چسپی لیتی ہیں۔ میری قابل ذکر تصانیف، تالیفات اور تراجم میں "جوہر قابل" (مولانا محمد علی جوہر کی کہانی اور کارنامے)، "صحت کی الف بے"، "حکیم محمد سعید کے علمی مشورے"، "دو مسافر دو ملک" (اردو میں بچوں کا پہلا سفرنامہ)، "موتی کرسٹو کا نواب" (انگریزی ڈراما کے ناول کا ترجمہ)، "پیاری سی پہاڑی لڑکی" (ترجمہ ناول)، "ایک کھلا راز" (مجموعہ مضامین)، "وہ بھی کیا دن تھے" (ترجمہ)، "ہزاروں خواہشیں" (چارلس ڈکنس کے ناول کا ترجمہ)، "صحت کے 9 9 نکتے"، "فرہنگ اصطلاحات طب" (نظر ثانی)، "چور پکڑو" (مجموعہ مضامین)، "تین بندوقچی" (تھری مسکیٹیئرز کا ترجمہ) شامل ہیں۔

حکیم صاحب کی سوانح حیات "پروفائل آف اے ہیومینیٹیرین" مسز ذی سلوا کے ساتھ شریک مصنف بھی رہا۔ ان کے علاوہ 20 سے 25 کتابیں وہ ہیں جو میں نے شہید حکیم محمد سعید کی تحریروں سے مرتب کیں، ان کی تفصیل حافظے سے بتانا مشکل ہے۔

ایکسپریس: بچوں کے لیے سفرنامہ "دو مسافر، دو ملک" کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی، اسے لکھنے کا خیال کیسے آیا؟

مسعود احمد برکاتی: 1982 میں ماہنامہ "یونیسکو پیامی" (یونیسکو کوریئر) کی میٹنگ میں شرکت کے لیے پیرس (شہید حکیم محمد سعید اور مجھے) پیرس جانا تھا۔ اس میٹنگ میں تمام دنیا سے رسالہ "یونیسکو کوریئر" کے مدیران آئے تھے۔ پیرس سے پہلے ہم لندن بھی گئے۔ پیرس کی میٹنگ بہت مفید اور کام یاب رہی۔ اس میں خاص طور پر چین اور ہندوستان کے مدیروں سے ملنے کا بھی موقع ملا۔ یہ دل چسپ اور مفید سفر خود اس بات کے متقاضی تھے کہ ان کو لکھا جائے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس سفر نامے کو اس طرح لکھا جائے کہ بچوں کے لیے بھی سبق آموز ہو۔ چناں چہ "دو مسافر دو ملک" کے نام سے اس سفر کے حالات ہمدرد نونہال میں قسط وار لکھنے شروع کردیے جو بچوں کے علاوہ بڑوں کے لیے بھی معلومات افزا ثابت ہوئے اور پھر ان کو کتابی صورت میں شائع کرنا ضروری لگا۔

ایکسپریس: آپ کو کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ اس حوالے سے کچھ بتائیے۔

مسعود احمد برکاتی: میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کسی زبان پر عبور حاصل ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اردو کے علاوہ عربی، فارسی، انگریزی اور روسی زبان پڑھی ہے۔ ان میں عربی اور روسی استعمال میں نہ آنے کی وجہ سے فراموش ہوتی جارہی ہیں۔ عربی تو پھر بھی قرآنی تعلق کی وجہ سے اور اردو ادب پر اپنے اثرات کی وجہ سے آس پاس رہتی ہے، لیکن روسی زبان تو میں نے بڑے شوق سے سیکھی تھی اور اس کے لیے ہر روز نہ فرینڈ شپ ہاؤس جاتا تھا۔ وہاں ڈاکٹر شریف صاحب روسی پڑھاتے تھے۔ ان کی خصوصی توجہ اور پڑھانے کے پرخلوص انداز کی وجہ سے مجھ جیسے طالب علم کی دل چسپی اور لگن بڑھتی جاتی تھی۔ ڈاکٹر شریف صاحب نے ماسکو جاکر روسی زبان سیکھی تھی اور پی ایچ ڈی کیا تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے۔ اس لیے میرا احترام کرتے تھے کہ مجھے شرمندگی ہونے لگتی تھی۔ کیا بات تھی ان کی علم دوستی کی، شاگرد کی حیثیت سے میں پریشان ہوجاتا تھا۔ افسوس کہ ڈاکٹر شریف صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ ایک نادر انسان تھے۔ فارسی سے واقفی رہا زیادہ ہے۔ بچپن میں "گریٰ"، "گلستان"، "بوستان" پڑھنے اور اس کے بعد شبلی کی "شعر العجم" کا مطالعہ فارسی سے قرب پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ فارسی اشعار خود بہ خود یاد ہوجاتے تھے۔ اردو تو زندگی کا حصہ ہے، روزانہ لکھتا ہوں اور احساس ہوتا ہے کہ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔

میرا یہ شعر آپ کو یاد ہو گا:

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا، ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

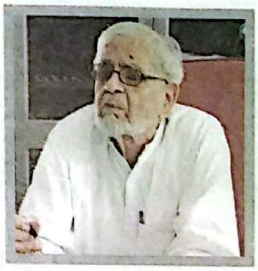
ایکسپریس: جدید ٹیکنالوجی بچوں کو کتابوں سے دور کررہی ہے۔ اس صورت حال کے سدباب کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہییں؟

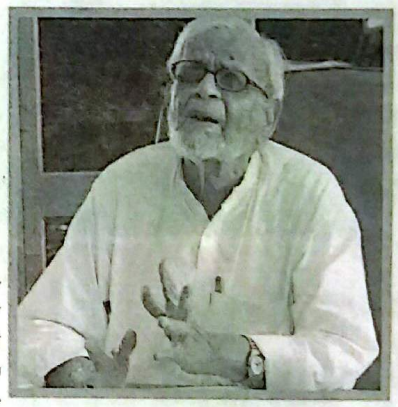
مسعود احمد برکاتی: جدید ٹیکنالوجی یا کہیے کہ سائنس کا مکمل پہلو، اس دور میں سائنس اپنے عروج پر ہے۔ سائنس بھی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا علم ہے۔ کلام پاک میں ہے:

عَلَّمَ الْاِنسَانَ مَالَمْ یَعْلَم (سورۂ علق آیت نمبر 4)

یعنی "اللہ نے انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا"

اور یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا علم ہی ہے جس کی بدولت آج انسان کو دنیا کی مرفعت، ہر راحت، ہر سہولت میسر ہے۔ سائنس بھی اللہ کے دیے ہوئے علم کا حصہ ہے۔ علم کی بدولت انسان پہلے خلا میں اور پھر چاند پر پہنچا۔ سرکار دو عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے جو علامہ اقبال کے الفاظ میں کچھ یوں ہے:





سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

تو ہمیں جدید ٹیکنالوجی کو برائیں سمجھنا چاہیے، بلکہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ زمانہ گیا کہ مولوی صاحبان ریڈیو کو حرام سمجھتے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ اب یہ سب ایجادات انسان کو سہولتیں پہنچا رہی ہیں اور انسان آگے بڑھ رہا ہے۔ بے شک کتابوں سے بچوں کی رغبت کم ہوگئی ہے لیکن کتاب کی اہمیت ہے اور باقی رہے گی۔ کتاب سے دل چسپی برقرار رکھنے میں ماں باپ اور استاد بڑا اہم کردار ادا کرسکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کی ترقی نے طباعت واشاعت کی سہولتوں میں بھی اضافہ کیا ہے۔ اب کتاب چھپنا پہلے کی طرح مشکل نہیں رہا۔ پہلے کتابت بھی ایک سخت مرحلہ تھا۔ اب کمپوزنگ اور نوری تنسیخ کی ایجاد نے طباعت واشاعت کو بہت آسان کردیا ہے۔ اب بچوں کی کتابوں کو بہت باتصویر، پرکشش اور خوب صورت بنایا جاسکتا ہے۔ یہ بھی سائنسی پیش رفت ہے کہ بچوں کے لیے کتابیں پرکشش بنائی جائیں۔

ایکسپریس: ہمدرد نونہال کی کام یابی کا سہرا کس کے سر جاتا ہے؟

مسعود احمد برکاتی: بڑا مشکل سوال ہے۔ ہمدرد نونہال کی کام یابی کا سہرا سب سے پہلے تو نونہالوں یعنی رسالے کے قارئین کے سر بندھتا ہے۔ رسالے کو پسند کرکے انھوں نے ہمیں ہمت دی۔ شہید حکیم محمد سعید کو بچوں سے بڑا پیار تھا اور ان کی تعلیم وتربیت کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ہمدرد نونہال کے بانی وہی تھے اور نہ صرف بانی بل کہ اس کے معمار بھی وہی تھے۔ مجھے بچوں کے لیے لکھنے پر آمادہ بھی انھوں نے ہی کیا۔ پھر ان سب ادیبوں اور شاعروں کو یہ کریڈٹ دینا چاہیے جنھوں نے اس (نونہال) کے لیے لکھا اور اپنی تحریروں سے اس کو دل چسپ اور مفید بنایا، لیکن میرے لیے ان سب کا نام لکھنا مشکل ہے، جو نام ذہن میں آرہے ہیں وہ بتاتا ہوں:

"حامد اللہ افسر"، "علی ناصر زیدی"، "محشر بدایونی"، "مسلم ضیائی"، "اشرف صبوحی"، "علی اسد"، "عشرت رحمانی"، "پروفیسر حبیب اللہ رشدی"، "مرزا ظفر بیگ"، "محمد حسین حسان"، "تسلیم الٰہی زلفی"، "شام لکھنوی"، "عبداللہ عابد"، "قائم مصطفیٰ صدیقی"، "شمیم"، "سید ابوالخیر کشفی"، "وحیدہ نسیم"، "ماہر القادری"، "سائل فاروقی"، "عبدالحمید نظامی"، "عارف نجاری"، "الطاف فاطمہ"، "ایم اسلم"، "کوثر چاند پوری"، "سحر انصاری"، "مناظر صدیقی"، "محسن کاکوروی"، "سلطان جمیل نسیم"، "رفیع الزماں زبیری"، "طالب ہاشمی"، "تنویر پھول"، "سلیم فرخی"، "پروفیسر انجم اعظمی"، "رفیع علی انوری"، "ڈاکٹر اسلم فرخی"، "غلام حسین میمن"، "ادیب سہیل چنہ"، "حکیم ابراہیم شاہ"، "اشتیاق احمد"، "ضیاء الحسن ضیاء"، "وقار محسن"، "نذیر انبالوی"، "کیپٹن عزیز مرزا"، "عباس العزم"، "شان الحق حقی"، "ناخدا تقی"، "رحیم الدین"، "ڈاکٹر اسعد اریب"، "خانزادہ سمیع الوری"، "میر اسید"، "امان اللہ نیر شوکت"، "ناصر زیدی"، "انور آس محمد"، "نسرین شاہین"، "انور فرہاد"، "حکیم خاں حکیم"، "معراج (خواجہ محمد عارف)"، "وقار محسن"، "عصمت علی بلیل"، "انور شعور"، "فیض لدھیانوی"، "عبدالغنی شمس کھتری"، "عفت گل اعزاز"، "سرور بجنوری"، "احمد خان خلیل"، "احمد ہمانی"، "سید رشید الدین احمد"، "ابرار محسن"، "جمیل جالبی"، اور ان کے علاوہ بہت سے نام ایسے ہیں جو اب حافظے میں نہیں ہیں۔

ایکسپریس: تقسیم سے قبل آپ نے اپنا ایک پرچہ بھی نکالا تھا۔ کیا دوبارہ کبھی اپنا پرچہ نکالنے کا خیال آیا؟

مسعود احمد برکاتی: میں نے اپنے دادا علامہ حکیم سید برکات احمدؒ کے نام پر ایک قلمی (ہاتھ سے لکھا گیا) رسالہ نکالا تھا، اسے میں کاتب صاحب سے لکھوا کر شہر کی 2 بڑی پبلک لائبریریوں میں 10,10 دن کے لیے رکھوا دیتا تھا۔ اس طرح پورا شہر اس کو پڑھ سکتا تھا۔ اُس زمانے میں طباعت بہت مشکل مسئلہ تھا۔ اس لیے "البرکات" قلمی ہی شائع ہوتا رہا۔

ایکسپریس: زمانہ طالب علمی میں آپ کا شمار ذہین طلبا میں کیا جاتا تھا یا اوسط طالب علم تھے؟

مسعود احمد برکاتی: زمانہ طالب علمی میں مجھے صرف ذہین نہیں بلکہ بہت ذہین کہا جاتا تھا اور شاید اس کی وجہ میرا لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ ورنہ دنیاوی اعتبار یا عام معیار سے دیکھا جائے تو مجھے "بہت ذہین" کہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

ایکسپریس: کس ادیب کو سب سے زیادہ پڑھا؟

مسعود احمد برکاتی: اُس زمانے کے تمام ہی مشہور ومقبول ادیبوں، افسانہ نگاروں اور شاعروں کو پڑھا۔ مطالعے کا شوق بچپن ہی سے ساتھ ہے۔ گھر میں باپ دادا کا کُتب خانہ تھا، باتیں بھی کتابوں، مصنفوں اور ادیبوں کی ہوتیں۔ اردو کے ادبی رسائل کے ساتھ ساتھ مفتی کرشن چندر، بیدی اور عصمت چغتائی کے افسانے بھی پڑھے۔ "مولانا ابوالکلام آزاد"، "پروفیسر رشید احمد صدیقی"، "پروفیسر آل احمد سرور"، "حامد حسن قادری" کو بھی پڑھا۔ جدید مزاح کے ادیبوں میں احسن فاروقی اور محمد حسن عسکری کی تحریروں کا جستہ جستہ مطالعہ کیا۔ لیکن کسی ادیب کا نام اس لحاظ سے نہیں لے سکتا کہ میں نے اس کو سب سے زیادہ پڑھا۔

ایکسپریس: حکیم سعید شہید کی شخصیت کو آپ نے کیسا پایا؟

مسعود احمد برکاتی: حکیم محمد سعید ایک غیر معمولی انسان تھے۔ کئی اعتبار سے وہ منفرد تھے۔ نہایت ذہین، مجسم عمل، متحرک، کام کرنے والوں کے قدرداں، نئی باتیں سوچنے والے، نئی باتوں کو خوشی سے قبول کرنے والے، وقت کے بے مثال قدرداں، ہمیشہ آگے دیکھنے والے، سادہ مزاج، سادہ زندگی گزارنے والے تھے۔ انہوں نے کبھی سرمایہ جمع کرنے کی خواہش نہیں کی۔ کراچی میں ایک مکان تھا، اسی میں زندگی شروع کی اور آخری سانس تک اسی میں رہے۔ کوئی اور مکان یا جائیداد نہیں بنائی، جب کہ ہمدرد ادارے کے لیے کراچی اور پاکستان کے کئی بڑے شہروں میں لاکھوں کروڑوں کی عمارتیں بنائیں۔ ہمدرد یونی ورسٹی کی تمام عمارتیں اور ہمدرد اسکول کی عمارتیں خود اپنی نگرانی میں بنوائیں، مگر ان میں سے کوئی ذاتی جائیداد نہیں ہے۔ آخر تک اپنے لیے بس ایک کار رکھی۔

ایکسپریس: سعدیہ راشد صاحبہ حکیم سے کس طرح مختلف ہیں؟

مسعود احمد برکاتی: سعدیہ راشد صاحبہ حکیم صاحب سے بہت مختلف ہیں، لیکن انھی کی تربیت یافتہ ہیں۔ اسی انداز سے سوچنا، ویسے ہی اخلاق، انکسار، بڑوں کی عزت، چھوٹوں پر شفقت، سادہ مزاج، سادہ لباس، محنت کی عادی، مکمنہ حد تک سوشل روابط کی پاس دار، ہمدرد فاؤنڈیشن کے نظام کو قائم رکھنے میں اور اس کے فلاحی کاموں کو جاری رکھنے میں کوشاں ہیں۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کی مطبوعات کو جاری رکھتی ہیں۔ ہمدرد صحت اور ہمدرد نونہال کی بہتری ترقی سے خوش ہوتی ہیں اور ان کی ترقی اور صحت کی تمام تر خوشی سے قبول کرتی ہیں۔

ایکسپریس: نونہال اور ہمدرد صحت دو الگ الگ میڈیم ہیں۔ دونوں کی زبان اور انداز ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے۔ ایک ہی وقت میں دو الگ الگ انداز میں کس طرح لکھتے ہیں؟

مسعود احمد برکاتی: بے شک دونوں رسالوں کے میدان اور دائرہ موضوعات بالکل مختلف ہیں۔ ہمدرد صحت اور ہمدرد نونہال کی زبان اور تخلیقات میں بہت فرق ہے، لیکن عادت پڑ گئی ہے۔ جب ایک رسالہ مکمل کرکے پریس بھیج دیتا ہوں تو دوسرا شروع کرتا ہوں اور اس کی تحریر وترتیب میں اپنی ٹیم کے ساتھ ہمہ تن مصروف ہوجاتا ہوں۔ شوق اور محنت، یہ دونوں خصوصیات انسان سے بڑے بڑے مشکل کام کرواتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ہر مہینے دو پیچ پیدا کرتے ہو۔ میں ان کو بتاتا ہوں کہ ان بچوں کی پیدائش اور پرورش کے علاوہ دیگر انتظامی اور دفتری کام بھی ہیں۔ خط و کتابت ہے۔ "فون صاحب" بھی اپنی اہمیت منواتے ہیں۔ ملنا جلنا ہے۔ مشاورت کی میٹنگیں بھی ہوتی ہیں۔ غرض بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔

ایکسپریس: کیا اپنے بچوں کو اپنا ورثہ منتقل کیا ہے؟

مسعود احمد برکاتی: جی نہیں، نہ ادب اور نہ دولت۔ دولت بس حسب ضرورت حاصل کی اور باعزت زندگی گزاری۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی، لیکن ان کے مزاج اور میدان مختلف رہے۔ بس شریفانہ زندگی گزار رہے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔ میں نے اپنی زندگی خود بنائی۔ اگرچہ جاگیردار اور دولت مند گھرانے میں پیدا ہوا، لیکن آزادی اور ملک کی تقسیم نے سب کایا پلٹ دی، لیکن میری ماں کی تربیت ایسی ہے کہ اللہ کا شکر ہے کہ غلط راستے پر نہیں گیا اور رزق حلال کے لیے کسی کام کو برا نہ سمجھا، نہ شرمایا۔ نہ ماضی کا ماتم کیا۔ چھے، آٹھ مہینے کی ایک ٹیوشن پڑھا کر اپنی معاشی زندگی شروع کی اور قدم جما کر چلا۔ کسی سے مدد نہیں لی اور ایک شریفانہ ومہذبانہ زندگی بسر کی۔

ایکسپریس: نئے ادیبوں کو کیا مشورہ دینا پسند کریں گے؟

مسعود احمد برکاتی: نئے ادیبوں کے لیے بہترین مشورہ یہ ہے کہ جس ادیب کا اسلوب پسند ہو اس کی تحریروں کو اپنے ہاتھ سے نقل کریں، مگر عقل کے ساتھ۔ زیادہ سے زیادہ لکھیں۔ اپنی تحریر پر پوری توجہ سے نظر ثانی کریں۔

میں ایک بار ہمدرد نونہال میں "خوب نقل کرو" کے عنوان سے ایک مضمون میں یہ باتیں لکھ چکا ہوں۔ ابتدا میں شائع ہونے نہ ہونے کی اتنی فکر نہ کریں اور لکھے جائیں۔ مطالعہ بھی ترک نہ کریں۔

ایکسپریس: آپ نے ترانے زیادہ کیے ہیں، اس کی کوئی خاص وجہ؟

مسعود احمد برکاتی: میں نے تراجم کیے ہیں، مگر زیادہ نہیں، اپنی تحریریں زیادہ لکھی ہیں۔ البتہ انگریزی کے بعض کلاسیکی ناولوں کو اردو میں ڈھالا ہے۔ ورنہ مزاجاً اپنی تخلیق زیادہ پسند آتی ہے۔●

تاریخ وفات:- 10 دسمبر 2017ء
11 بجے رات
22 ربیع الاول

ناکام نہیں رہا

اپنی زندگی ضائع نہیں ہونے دی

دنیا چھوڑ جانے والے بچوں کے معروف ادیب مسعود احمد برکاتی

کا ایک یادگار انٹرویو

دنیا چھوڑ جانے والے بچوں کے معروف ادیب مسعود احمد برکاتی کا ایک یادگار انٹرویو

سید بابر علی

بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے کو ہمارے ہاں عمومی طور پر کارِ زیاں سمجھا جاتا ہے، لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے ننھے منے ذہنوں میں علم و آگہی کے چراغ منور کرنے کے لیے پوری عمر لگا دی۔ پاکستان کے ایسے قلم کاروں میں مسعود احمد برکاتی سرفہرست ہیں۔ بہ طور مدیر ''ہمدرد نونہال'' بچوں کی تہذیبی، اخلاقی اور لسانی تربیت اور انھیں ایک اچھا شہری بنانے کی سعی مسلسل کے حوالے سے ان کا نام سنہری حروف میں لکھا جانا چاہیے۔ تاہم یہ فقیر منش، درویش صفت انسان، بیحد ستایش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز رہا۔ گزشتہ اتوار دس دسمبر کو دنیا چھوڑ جانے والے مسعود احمد برکاتی آج ہم میں نہیں، لیکن جب بھی نونہالانِ وطن کی تربیت، کردار سازی، ان میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے کی بات کی جائے گی تو مرحوم کا نام ضرور لیا جائے گا۔ ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ یہاں ہم ان کا ایک انٹرویو پیش کررہے ہیں جو ''ایکسپریس'' سنڈے میگزین میں 4 مئی 2014ء کو شایع ہوا تھا۔ یہ انٹرویو ان کی مجھے دہائیوں پر پھیلی خدمات، افکار اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔

ایکسپریس: پاکستان میں بچوں کے ادب کا مستقبل کیا دیکھتے ہیں؟

مسعود احمد برکاتی: پاکستان میں بچوں کے ادب کا مستقبل تاب ناک نہیں۔ کئی اسباب ہیں جو ناامید کرتے ہیں۔ ہمارے علم رانوں کو ذرا احساس نہیں ہے۔ علم رانوں میں وہ دانشور اور اہل قلم اور ایسے اداروں کے سربراہ بھی شامل ہیں جو علم و ادب اور قومی زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے ہی قائم کیے گئے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھنے والوں کی قدر نہیں کی گئی تو لکھنے والے کیسے پیدا ہوں گے۔ آپ بتایئے کہ بچوں کے لیے سال ہا سال سے لکھنے والے کسی ادیب کو کوئی اعزاز دیا گیا، جب کہ بچپن میں بچوں کے رسائل اور تحریریں پڑھنے والوں میں نواز شریف صاحب اور کئی وزرائے اعظم بھی شامل ہیں۔ کئی بڑی جماعتوں کے سربراہ اور کئی وائس چانسلر صاحبان بھی بچوں کے رسائل پڑھتے تھے۔

ایکسپریس: بچوں کے رسالوں کی تعداد دن بہ دن کم ہونے کی وجوہات؟

مسعود احمد برکاتی: بچوں کے رسائل کی مقبولیت میں کمی کی وجوہ میں الیکٹرانک ٹیکنالوجی کی سہولتوں کا عام ہونا بھی ہے۔ انٹرنیٹ اس دور کی ایک نہایت مفید پیش رفت ہے۔ یہ بھی رسائل و کتب کے مطالعے کی جگہ لے رہا ہے۔

ایکسپریس: بچوں کے ادیبوں کو حکومتی سطح پر پزیرائی نہ ملنے کا سبب کیا ہے؟

مسعود احمد برکاتی: اس کی وجہ قوم کے مستقبل سے بے پروا ہو کر علم رانوں کا وقتی مسائل میں کھو جانا ہے۔ بچوں کے ادیبوں کو مکمل ادیب ہی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ آج تک بچوں کے کسی ادیب کو کوئی بڑا ایوارڈ نہیں دیا گیا۔ بچوں کے کسی ادیب کو صدر یا وزیر اعظم کے ساتھ بیرونی دوروں پر نہیں لے جایا جاتا۔ بچوں کے لیے لکھنے والوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، البتہ ان ادیبوں کی تحریریں پڑھنے والے قارئین اپنی محبت سے اس بے نیازی کی بڑی حد تک تلافی کر دیتے ہیں۔ مطالعے کے رجحان میں آنے والی کمی اور الیکٹرانک میڈیا کا زور بھی لوگوں کو کتابوں سے دور کر رہا ہے۔ عام طور سے ادیبوں کو ان کی تخلیقات کا معاوضہ نہیں ملتا، حکومت ایسی تدابیر اختیار کرے، جس سے قلم کاروں کو معاوضہ ملنے کی صورت نکلے۔ اپنی کتابیں خود شایع کرنے والے ادیبوں کو رعایتی نرخ پر کاغذ مہیا کیا جائے۔ حکومت علمی، ادبی اور بچوں کے رسائل کو قطع نظر ان کی تعداد اشاعت کے، زیادہ سے زیادہ اشتہارات دے۔

ایکسپریس: ہمدرد کے ساتھ چھے سے زاید دہائیوں تک علمی، ادبی فلاحی اور سماجی خدمات انجام دینے سے مجھے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی ضائع نہیں کی اور کوشش کی کہ اپنی بہترین ذہنی اور علمی صلاحیتوں سے شہید حکیم محمد سعید کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل میں حصہ لوں اور یکسوئی کے ساتھ اپنے قلم کی طاقت کو تعمیرِ ملت اور فروغِ علم و اخلاق میں صرف کروں۔ میں ناکام نہیں رہا۔

ایکسپریس: اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتایئے۔

مسعود احمد برکاتی: میری تاریخ پیدائش 10 اگست 1933 لکھی جاری ہے، لیکن صحیح نہیں ہے۔ اصلی تاریخ مجھے یاد نہیں، لیکن وہ اس سے چند سال پہلے کی ہے۔ معلوم نہیں یہ غلط تاریخ کیسے عام ہوگئی۔ میں ریاست ٹونک (راجستھان) میں پیدا ہوا۔ میں اپنے خاندان کا پہلا فرد ہوں جس نے انگریزی تعلیم اور پڑھی۔ میری والدہ محترمہ بشیر النساء بیگم کی یہ بصیرت تھی کہ انھوں نے مولویوں کی شدید مخالفت کے باوجود گھر پر استاد (ٹیوٹر) رکھ کر انگریزی پڑھوائی۔ اس وقت ہمارے خاندان میں دینی تعلیم ضروری تھی۔ عربی، فارسی ضروری تھی۔ جاگیردار گھرانا ہونے کی وجہ سے تعلیم صرف علم کے لیے دی جاتی تھی۔ کسی سند کی ضرورت اور اہمیت نہیں تھی، لیکن علم میں گہرائی اور وسعت ہونی ضروری تھی۔ کھیلتا کودتا تھا، مگر بہت کم، میں نے کرکٹ کھیلی مگر زیادہ دن نہیں۔

ایکسپریس: اب تک کتنی کتابیں اور سفرنامے لکھ چکے ہیں؟

مسعود احمد برکاتی: اب تک لکھا تو بہت ہے۔ بڑوں کے لیے لکھنا شروع کیا تھا۔ نفسیاتی مضامین لکھے۔ متفرق موضوعات پر بھی لکھا، 1951 میں ماہنامہ ''معاشیات'' کراچی میں ''اشتراکیت''، ''کارل مارکس''، ''تاریخ کی مادی تعبیر''، ''طبقاتی نزاع''، ''اشتراکیت'' اور ''مذہب'' کے عنوانات سے علمی اور غیر سیاسی مضامین لکھے۔

رسالہ ''معاشیات'' بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو، پاکستان سے جاری کیا تھا۔ جناب محمد احمد سبزواری اس کے ایڈیٹر تھے۔

1953 میں شہید حکیم محمد سعید نے بچوں کا ماہنامہ ہمدرد نونہال میرے سپرد کیا۔ یوں مجھے بچوں کے لیے لکھنا پڑا۔ مسلسل 62 سال سے بچوں کے لیے لکھ رہا ہوں۔ ہر سال اس کا ایک ضخیم خاص نمبر نکالتا ہوں۔ حکیم صاحب بچوں کے مستقبل کو قوم کا مستقبل سمجھتے تھے اور ہمدرد نونہال کی ترقی اور وسعت کے لیے ہر تجویز اور تدبیر سے خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ حکیم صاحب کی شہادت کو 15 سال سے زاید کا عرصہ ہوگیا ہے۔ ہمدرد نونہال اسی باقاعدگی اور پابندی سے نکل رہا ہے۔ محترمہ سعدیہ راشد (صدر ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان) بھی حکیم صاحب کی طرح دل چسپی لیتی ہیں۔ میری قابل ذکر تصانیف، تالیفات اور تراجم میں ''جوہر قابل'' (مولانا محمد علی جوہر کی کہانی اور کارنامے)، ''صحت کی الف بے''، ''حکیم محمد سعید کے طبی مشورے''، ''دو مسافر دو ملک'' (اردو میں بچوں کا پہلا سفرنامہ)، ''مونٹی کرسٹو کا نواب'' (الیگزینڈر ڈوما کے ناول کا ترجمہ)، ''بیاری سی پیاری لوکی'' (ترجمہ ناول)، ''ایک کھلا راز'' (مجموعہ مضامین)، ''وہ بھی کیا دن تھے'' (مرتبہ)، ''ہزاروں خواہشیں'' (چارلس ڈکنس کے ناول کا ترجمہ)، ''صحت کے 99 نکتے''، ''فرہنگ اصطلاحات طب'' (نظر ثانی)، ''پور کپڑوا'' (مجموعہ مضامین)، ''تین بندوقچی'' (ترجمہ) شامل ہیں۔

ایکسپریس: سفرنامہ ''دو مسافر، دو ملک'' لکھنے کا خیال کیسے آیا؟

مسعود احمد برکاتی: 1982 میں ماہنامہ ''یونیسکو پیامی'' (یونیسکو کوریئر) کی میٹنگ میں شرکت کے لیے ہمیں (شہید حکیم محمد سعید اور مجھے) پیرس جانا تھا۔ اس میٹنگ میں تمام دنیا سے رسالہ ''یونیسکو کوریئر'' کے مدیران آئے تھے۔ پیرس سے پہلے ہم لندن بھی گئے۔ پیرس کی میٹنگ بہت مفید اور کام یاب رہی۔ اس میں خاص طور پر چین اور ہندوستان کے مدیروں سے علیحدہ بھی ملاقاتیں رہیں۔ یہ دل چسپ اور مفید سفر خود اس بات کے متقاضی تھے کہ ان کو لکھا جائے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس سفرنامے کو اس طرح لکھا جائے کہ بچوں کے لیے بھی سبق آموز ہو۔ چناں چہ ''دو مسافر دو ملک'' کے نام سے اس سفر کے حالات ہمدرد نونہال میں قسط وار لکھنے شروع کر دیے جو بچوں کے علاوہ بڑوں کے لیے بھی معلوماتی ثابت ہوئے اور پھر ان کو کتابی صورت میں شائع کرنا ضروری لگا۔

ایکسپریس: آپ کو کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ اس حوالے سے کچھ بتایئے۔

مسعود احمد برکاتی: میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کسی زبان پر عبور حاصل ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اردو کے علاوہ عربی، فارسی، انگریزی اور روسی زبان پڑھی ہے۔ ان میں عربی اور روسی استعمال میں نہ آنے کی وجہ سے فراموش ہوتی جارہی ہیں۔ عربی تو پھر بھی تھا فتی تعلق کی وجہ سے اور اردو ادب پر اپنے اثرات کی وجہ سے آس پاس رہتی ہے، لیکن روسی زبان تو میں نے بڑے شوق سے سیکھی تھی اور اس کے لیے روز انہ فرینڈ شپ ہاؤس جاتا تھا۔ وہاں ڈاکٹر شریف صاحب روسی پڑھاتے تھے۔ ان کی خصوصی توجہ اور پڑھانے کے پُرخلوص انداز کی وجہ سے مجھ جیسے طالب علم کی دل چسپی اور لگن بڑھتی جاتی تھی۔ ڈاکٹر شریف صاحب نے ماسکو جا کر روسی زبان سیکھی تھی اور پی ایچ ڈی کیا تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے۔ اس لیے میرا انتالحاظ بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ احترام کرتے تھے کہ مجھے شرمندگی ہونے لگتی تھی۔ کیا بات تھی ان کی علم دوستی کی، شاگرد کی حیثیت سے میں پریشان ہو جاتا تھا۔ افسوس کہ ڈاکٹر شریف صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ ایک نادر انسان تھے۔ فارسی سے ذہنی ربط زیادہ ہے۔ فارسی اشعار آسانی سے یاد ہو جاتے تھے۔ اردو تو زندگی کا حصہ ہے، روزانہ سیکھتا ہوں اور احساس ہوتا ہے کہ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔

ایکسپریس: جدید ٹیکنالوجی بچوں کو کتابوں سے دور کر رہی ہے۔ ان میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہییں؟

مسعود احمد برکاتی: جدید ٹیکنالوجی یا سائنس اپنے عروج پر ہے جس کی بدولت آج انسان کو دنیا کی ہر نعمت، ہر راحت، ہر سہولت میسر ہے۔ سائنس بھی علم کا حصہ ہے۔ علم کی بدولت انسان پہلے خلا میں اور پھر چاند پر پہنچا۔ ہمیں جدید ٹیکنالوجی کو برا نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ زمانہ گیا کہ مولوی صاحبان ریڈیو کو برا سمجھتے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ اب یہ سب ایجادات انسان کو سہولتیں پہنچا رہی ہیں اور انسان آگے بڑھ رہا ہے۔ بے شک کتابوں سے بچوں کی رغبت کم ہوگئی ہے، لیکن کتاب کی اہمیت ہے اور باقی رہے گی۔ کتاب سے دل چسپی برقرار رکھنے میں ماں باپ اور استاد بڑا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کی ترقی نے طباعت و اشاعت کی سہولتوں میں بھی اضافہ کیا ہے۔ اب کتاب چھپنا پہلے کی طرح مشکل نہیں رہا۔ پہلے کتابت بھی ایک سخت مرحلہ تھا۔ اب کمپوزنگ اور نوری تعلیق کی ایجاد نے طباعت و اشاعت کو بہت آسان کر دیا ہے۔ اب بچوں کی کتابوں کو بہت باتصویر، پرکشش اور خوب صورت بنایا جا سکتا ہے۔

ایکسپریس: ہمدرد نونہال کی کام یابی کا سہرا کس کے سر جاتا ہے؟

مسعود احمد برکاتی: بڑا مشکل سوال ہے۔ ہمدرد نونہال کی کام یابی کا سہرا سب سے پہلے تو نونہالوں یعنی رسالے کے قارئین کے سر بندھتا ہے۔ رسالے کو پسند کر کے انھوں نے ہمیں ہمت دی۔ شہید حکیم محمد سعید کو بچوں سے بڑا پیار تھا اور ان کی تعلیم و تربیت کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ہمدرد نونہال کے بانی وہی تھے اور نہ صرف بانی بل کہ اس کے معمار بھی وہی تھے۔ مجھے بچوں کے لیے لکھنے پر آمادہ بھی انھوں نے ہی کیا۔ پھر اُن سب ادیبوں اور شاعروں کو یہ کریڈٹ دینا چاہیے جنھوں نے اس (نونہال) کے لیے لکھا اور اپنی تحریروں سے اس کو دل چسپ اور مفید بنایا۔ ●





بات چیت وعکاسی : واصف ناگی، لاہور

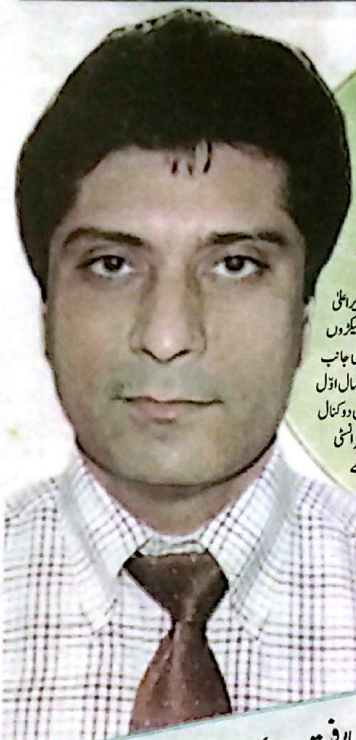
بصارت میں تیزی سے کمی کا بڑا سبب "اسکرین" ہے

اسٹیم سیل تھراپی اہم پیش رفت ہے، اندھے پن کا علاج بھی ممکن ہوگا

آنکھوں کو روزانہ 6 گھنٹے آرام چاہیے، سونف، بادام کا استعمال مفید ہے

کم روشنی میں اُلٹا لیٹ کر نہ پڑھیں، کمپیوٹر استعمال کرتے ہوئے پلکیں جھپکیں

معروف ماہرِ امراضِ چشم، ڈاکٹر خالد وحید سے خصوصی بات چیت



بے شک اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت، آنکھیں ہیں کہ ان ہی کی بدولت ہم تصویر کائنات میں بکھرے سب رنگ دیکھتے، زندگی کے اَک اَک پل سے بھرپور طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آنکھوں کی اصل اہمیت جاننی ہو تو کسی ایسے شخص سے پوچھ دیکھیں، جو اس نعمت سے محروم ہے۔ یا اگر آنکھوں کی کسی بیماری کے باعث وقتی طور پر بصارت چلی جائے یا کوئی اور طبّی مسئلہ لاحق ہو جائے، تو بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آنکھیں کتنی بڑی نعمت ہیں۔ اور اسی نعمت سے متعلق مختلف سوالات، مثلاً آنکھوں کے عوارض کون کون سے ہیں، کیا کسی مرض کے مضر اثرات بھی بینائی پر اثر انداز ہوتے ہیں، عینک سے نجات کے لیے لیزر سرجری مفید ہے یا پھر کانٹیکٹ لینسز وغیرہ، کے جوابات جاننے کے لیے ہم نے پاکستان کے معروف آئی سرجن پروفیسر ڈاکٹر خالد وحید سے بات چیت کی۔

ڈاکٹر صاحب نے حال ہی میں وزیرِ داخلہ، چوہدری نثار علی کی آنکھوں کی لائیسر جری کی ہے، جو وزیرِ اعلیٰ پنجاب نے بھی دیکھی۔ علاوہ ازیں، انہیں باغ بانی کا بے حد شوق ہے۔ ان کا گھر دنیا بھر کے سیکڑوں اقسام کے خُوب صُورت پھولوں سے اَٹا پڑا ہے۔ جب کہ وہ باقاعدگی سے ڈی ایچ اے، لاہور کی جانب سے منعقد کروائے جانے والے باغ بانی کے مقابلوں میں بھی نہ صرف حصّہ لیتے ہیں، بلکہ ہر سال اوّل انعام بھی حاصل کرتے ہیں اور ان کے اسی شوق کے پیشِ نظر ڈی ایچ اے، لاہور نے انہیں دو کنال اراضی پر مشتمل ایک پلاٹ بھی تفویض کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب، سروسز اسپتال اور سروسز انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز، لاہور کے شعبۂ امراضِ چشم میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ذیل میں ان سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل پیش کی جارہی ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

س: آنکھوں کی کون کون سی بیماریاں عام ہیں؟

ج: یوں تو آنکھوں کی بے شمار بیماریاں ہیں، لیکن سفید اور کالا موتیا، پیدائشی اور وقت کے ساتھ ساتھ اندھا پن زیادہ عام ہیں۔ علاوہ ازیں، بعض امراض بھی آنکھوں پر مضر اثرات مرتب کرتے ہیں، جیسا کہ ذیابطیس، جس میں مبتلا مریض بعض اوقات اندھے پن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تو انہیں چاہیے کہ کم از کم ہر چھے ماہ بعد آنکھوں کا معائنہ لازمی کروائیں۔

س: بعض افراد کی بینائی وقت کے ساتھ تیزی سے کم ہونے لگتی ہے اور ایک اسٹیج پر آکر رُک جاتی ہے، شکار افراد میں نوجوان طبقہ بھی شامل ہے، تو کیا یہ کوئی مرض ہے؟

ج: طبّی اصطلاح میں اسے ''پروگریسو یوٹوپیا'' (Progressive U Topia) کہا جاتا ہے، جس میں نظر کا نمبر بڑھنے کے ساتھ ساتھ آنکھوں کا پردہ بھی کم زور ہو جاتا ہے۔ تاہم، ایک اسٹیج پر آکر نظر کا کم زور ہونا رک جاتا ہے۔ بدقسمتی سے تاحال اس مرض کا کوئی حتمی علاج دریافت نہیں ہو سکا۔ اسی لیے ماہرین اس میں مبتلا مریضوں کو یہی مشورہ دیتے ہیں کہ وہ باقاعدگی سے اپنی بینائی کا معائنہ کرواتے رہیں۔ عموماً ایسے مریضوں میں تیس سال کی عُمر میں آکر عینک کا نمبر ایک جگہ رُک جاتا ہے۔ ویسے، یہ مرض دنیا بھر میں بہت ہی کم افراد کو متاثر کرتا ہے۔

س: ایک عام فرد کے سمجھنے کے لیے بتائیں کہ آنکھ کا سرطان کیا ہوتا ہے، نیز، کیا پاکستان میں اس کی شرح بلند ہے؟

ج: آنکھ کا سرطان ایک مہلک اور خطرناک عارضہ ہے کہ اس میں آنکھ ہی کو سرے سے نکالنا پڑ جاتا ہے، بہ صورتِ دیگر سرطان کی جڑیں دماغ تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ کیوں لاحق ہوتا ہے، تو اس کی وجوہ تاحال معلوم نہیں ہوسکیں۔ یہ بھی تو یہ پیدائشی طور پر بھی ہوتا ہے، تو کبھی کوئی مرض بھی اس کا موجب بن سکتا ہے۔ اس کی علامات کے حوالے سے بات کی جائے، تو سب سے پہلے بھینگا پن ظاہر ہوتا ہے، پھر آنکھ کا کالا حصّہ سفید ہونے لگتا ہے اور آنکھوں میں نیز ھاپن آجاتا ہے۔ اصل میں آنکھ کا سرطان پیچھے سے دباؤ ڈال رہا ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں سفید پن بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور 99 فی صد کیسز میں آنکھ نکالنی ہی پڑتی ہے۔ اگرچہ پاکستان میں مجموعی طور پر آنکھ کے سرطان کی شرح کم ہے، لیکن بڑوں کی نسبت بچّوں میں اس کی شرح زیادہ ہے۔

س: کیا پیدائشی بھینگا پن قابلِ علاج ہے؟

ج: جی بالکل، قابلِ علاج ہے، لیکن سات سال کی عُمر سے پہلے علاج ضروری ہے کہ بعد میں صحت یابی کے امکانات کم رہ جاتے ہیں۔ علاج کے ضمن میں پیدائشی بھینگے پن کی سرجری کی جاتی ہے، جو انتہائی مؤثر اور قابلِ بھروسا طریقۂ علاج ہے۔

س: پیدائشی اندھے پن کی کیا وجوہ ہوسکتی ہیں؟

ج: اس کی کئی وجوہ ہیں، لیکن سب سے عام وجہ کزنز میبر جز ہیں۔ اگر پیدائشی طور پر آنکھ کے پردے کی بیماری لاحق ہو، تو وہ لاعلاج ہوتی ہے۔ تاہم، آنکھ کا ایک مرض ''Rentinitis pigmentosa''ہے، جو کزنز میبر جز کے باعث لاحق ہوسکتا ہے۔ تو میری خواہش ہے کہ مَیں پاکستان میں اس مرض کے علاج کا آغاز کروں۔

س: اگر ذیابطیس کے سبب کسی مریض کی آنکھ کا پردہ متاثر ہو جائے، تو کیا یہ بھی قابلِ علاج ہے؟

ج: چوں کہ ذیابطیس پر صرف قابو پایا جاسکتا ہے، اس سے چھٹکارا ممکن نہیں، تو اس اعتبار سے جب تک مرض پر قابو رہتا ہے، آنکھ کے پردے متاثر نہیں ہوتے، لیکن اگر مرض کنٹرول میں نہ رہے، تو ایسے مریضوں کو بار بار لیزر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دراصل، سفید اور کالا موتیا اور ذیابطیس بڑھنے سے آنکھوں پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ سفید موتیا سے کوئی بھی فرد اندھے پن کا شکار نہیں ہوتا، لیکن اگر یہ بڑھ جائے، تو پھر نظر آنا بند ہو جاتا ہے اور صرف روشنی ہی کا پتا چلتا ہے۔ تاہم، سرجری کے بعد پھر سے دکھائی دینے لگتا ہے، لیکن اس کے کالے موتیا میں فنقلی ہونے کا خدشہ پھر بھی برقرار رہتا ہے۔ اس صورت میں مریض تاحیر بصارت کی صلاحیت سے محروم ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اگر ذیابطیس پر بھی قابو نہ رہے، تو بروقت علاج نہ ہونے کی صورت میں دیکھنے کی صلاحیت متاثر ہوسکتی ہے۔

س: سفید موتیا کے بعض مریض لینس لگائے جانے کے باوجود عینک استعمال کرتے ہیں، حالاں کہ آپریشن کے بعد نظر 6X6 ہو جاتی ہے؟

ج: دیکھیں، عموماً ایسا لینس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تاہم، جدید طریقۂ علاج میں صرف 2 ملی میٹر کا کٹ لگا کر لینس فولڈ کر کے آنکھ میں لگا دیا جاتا ہے، جس سے نہ صرف آنکھ کی ساخت صحیح رہتی ہے، بلکہ مریض پہلے سے بہت بہتر دیکھنے لگتا ہے۔ یعنی نظر کی کوالٹی 6X6 ہو جاتی ہے۔ اس طریقۂ علاج میں سرجری تو کی جاتی ہے، لیکن نہ تو ٹانکے لگائے جاتے ہیں اور نہ ہی کئی دنوں تک آنکھ کو ڈھانپ کر رکھا جاتا ہے۔ نیز، آپریشن کے اگلے روز ہی معمول کے کام بھی سرانجام دیئے جاسکتے ہیں۔ جب کہ اس سے قبل جو آپریشنز کیے جاتے تھے، ان میں ایک تو کٹ بڑا لگایا جاتا تھا، پھر کئی دنوں تک آنکھ ڈھانپ کر بھی رکھی جاتی تھی، جب کہ بھاگوں کے مسائل الگ تھے۔ یعنی کبھی ٹانکے ڈھیلے ہو گئے، تو کبھی نظر کی کوالٹی ہی بہتر نہ تھی۔

س: کیا یہ لینسز زندگی بھر کے لیے موثر ہوتے ہیں یا پھر کچھ عرصے بعد نظر کم ہونے لگتی ہے؟

ج: اب جو لینسز استعمال کیے جارہے ہیں، وہ تاحیر مؤثر رہتے ہیں، چوں کہ اس ضمن میں مزید تحقیق کا سلسلہ جاری ہے، تو قوی امکانات ہیں کہ مستقبل میں اس سے بہت بہتر معیار کے لینسز دستیاب ہوں گے۔ رہی یہ بات کہ لینس کے بعد نظر کم ہوسکتی ہے، تو یاد رکھیے، اگر لینسز کے پیچھے کی جھلی موٹی ہو جائے، تو نظر کم ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ عام طور پر لینسز کے پیچھے کی جھلی موٹی ہونے کی علامات آپریشن کے چھے ماہ بعد ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ اگر آپریشن کے بعد نظر بالکل ٹھیک ہو جائے اور کچھ عرصے بعد صاف دکھائی نہ دے، دھندلا دھندلا نظر آئے، تو فوری طور پر ماہر امراضِ چشم سے رجوع کیا جائے۔

س: سفید موتیے کے آپریشن کے بعد عموماً یہ شکایت ہو جاتی ہے کہ آنکھوں میں فلیشز پڑ رہے ہیں یا کالے دھبّے یا دھاگے نظر آتے ہیں، تو کیا یہ آپریشن کے مضر اثرات کہلائیں گے یا پھر.....؟

ج: قطعاً نہیں، یہ بالکل نارمل علامت ہے اور اس کے لیے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دراصل، نئے لینس لگائے جانے کے بعد بعض اوقات آنکھوں کی بناوٹ کی اندرونی خرابیاں تک دکھائی دینے لگتی ہیں۔ یعنی مریضوں کو جب اپنی آنکھ کی جھلی تک دکھائی دینے لگتی ہے، تو انہیں لگتا ہے کہ آنکھوں کے آگے جال سا بن گیا ہے۔ وہ دائیں دیکھتے ہیں، تو وہ جال دائیں جانب چلا جاتا ہے۔ بائیں طرف دیکھتے ہیں، تو وہ جال بائیں جانب چلا جاتا ہے، لیکن یہ علامات قطعاً مضر اثرات نہیں۔

س: مشاہدے میں ہے کہ سرکاری سطح پر جب سفید موتیے کا آپریشن کیا جاتا ہے، تو اعلیٰ معیار کے لینسز استعمال نہیں ہوتے اور مریض زندگی بھر کسی نہ کسی تکلیف کی شکایت ہی کرتے رہتے ہیں؟

ج: جی بالکل، ایسا ہی ہوتا ہے۔ چوں کہ اعلیٰ معیار کے لینسز کی لاگت تقریباً ایک تا ڈیڑھ لاکھ روپے ہے، جسے سرکاری سطح پر ہر مریض کو فراہم کرنا ممکن نہیں۔

س: کیا پاکستان میں آنکھوں کے امراض کے علاج کے ضمن میں بین الاقوامی معیار کی سہولتیں میسّر ہیں؟

ج: اب آنکھوں کے علاج اور آپریشنز کے لیے امریکا اور برطانیہ جانے کی قطعی ضرورت نہیں، کیوں کہ یہاں بھی بین الاقوامی معیار کی تمام تر سہولتیں میسّر ہیں۔ چاہے وہ آنکھ کے پردے کا مسئلہ ہو یا کالا موتیا یا پھر پتلی کا۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ بیرونِ ممالک، اگر کوئی آئی سرجن ریٹائر ہوتا ہے، تو وہ اس سے متعلقہ ہی مریضوں کا معائنہ کرے گا۔ حالاں کہ اس کے پاس امراضِ چشم کے حوالے سے ڈگری بھی ہے اور تجربہ بھی۔ اس کے برعکس پاکستان میں ایک ہی سرجن آنکھوں کی تمام بیماریوں کا علاج، بشمول ہر طرح کے آپریشن کرتا ہے۔ چوں کہ مَیں نے دنیا بھر کے نام ور آئی سرجنز کے ساتھ کام کیا ہے، تو میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ پاکستان کے آئی سرجنز کسی سے کم نہیں۔

س: اس وقت دنیا بھر میں امراضِ چشم کے علاج معالجے کے حوالے سے کیا کام ہو رہا ہے؟

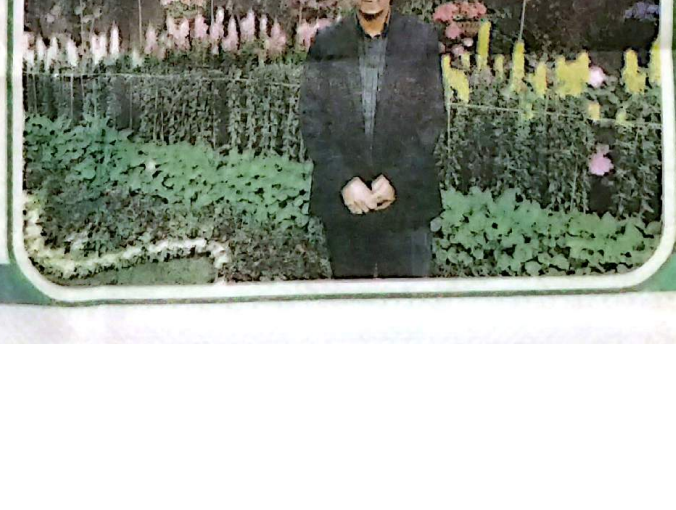
ج: اندھے پن کے حوالے سے خاصی تحقیق ہو رہی ہے۔ جب کہ فی الوقت جدید طریقۂ علاج اسٹیم سیل تھراپی (Stem Cell Therapy) پر بھی تحقیقی کام جاری ہے۔ یہ طریقۂ علاج آنکھ کے پردے کی بیماری کے لیے مستعمل ہے۔ نیز، اندھے پن کی بیماریوں کا تعلق بھی آنکھ کے پردے ہی سے ہے، تو اسٹیم سیل تھراپی کے حوالے سے برطانیہ کے دو اور امریکا کے تین سینٹرز میں مسلسل تحقیق کا عمل جاری ہے۔ اگرچہ اس علاج کے نتائج تسلی بخش ہیں، لیکن فی الحال اسے مریضوں کے لیے عام نہیں کیا گیا ہے، کیوں کہ جب تک دو بڑے ادارے ایف ڈی اے، یعنی فوڈ اینڈ ڈرگ ایڈمنسٹریشن اور این آئی سی ای سی (National Institute For Career Education & Counsellig) باقاعدہ طور پر اجازت نہیں دیں گے، اسے عام نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم، اُمید ہے کہ مستقبل میں اسی اسٹیم سیل تھراپی کی بدولت آنکھ کے پردے کی لاعلاج بیماریوں اور اندھے پن کا علاج بھی ممکن ہو جائے گا۔

س: آنکھ کے پردے کی بیماریوں کے متعلق بھی کچھ بتائیں؟

ج: آنکھ کے پردے کے امراض کی ایک بڑی وجہ ذیابطیس اور بلند فشارِ خون ہیں۔ اگر ان دونوں عوارض سے متاثرہ افراد اپنے مرض پر قابو رکھیں، تو ان کی آنکھ کا پردہ بالکل محفوظ رہے گا۔ لہٰذا ایسے مریضوں کو چاہیے کہ وہ باقاعدگی سے اپنی آنکھوں کا معائنہ کروائیں، تاکہ کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں بروقت علاج ممکن ہو سکے۔ مشاہدے میں ہے کہ عموماً ذیابطیس اور بلند فشارِ خون کے مریضوں کی آنکھوں کی شریانیں پھٹ جاتی ہیں۔ یہ صورتِ حال خاصی پیچیدہ ہے، ایسی نوبت آنے سے بہتر ہے کہ باقاعدہ معائنہ کروایا جاتا رہے۔

س: کیا عینک سے نجات کے لیے لیزر سرجری مفید ہے اور یہ کس حد تک محفوظ طریقۂ علاج ہے؟

ج: یہ بالکل محفوظ طریقۂ علاج ہے۔ تاہم، ہر آنکھ لیزر سرجری کے قابل نہیں ہوتی۔ بہتر ہوگا کہ لیزر سرجری کے لیے ایک تجربہ کار ماہر معالج ہی سے رجوع کیا جائے، جو آنکھ کا مکمل طور پر معائنہ کرے اور ہر طرح کی تسلی کے بعد ہی لیزر سرجری تجویز کرے، تاکہ آنکھیں کسی بھی قسم کے



جنگ

فیشن



پاکستان کی ثقافت کے عکاس۔۔۔ پنجابی پہناوے

حنا خان

پنجاب پاکستان کا وہ صوبہ ہے جس میں ثقافت تہواروں' کھانوں' پہناووں اور تاریخی مقامات سمیت ہزاروں رنگ سمائے ہوئے ہیں، جو جدید اور قدیم تہذیب کا حسین امتزاج ہے۔ پنجاب کی ثقافت دنیا بھر کی قدیم ترین ثقافتوں میں سے ایک تسلیم کی جاتی ہے۔ پنجاب کو "پنج" "آب" یعنی پانچ دریاؤں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔ مختلف قومیں اور ذات پات کے لوگ یہاں آباد ہیں۔ یہاں جو زبان بولی جاتی ہے اسے "پنجابی" کہا جاتا ہے، اور یہاں رہنے والے باشندوں کو پنجابی کہا جاتا ہے۔ پنجابی زبان کا حوالہ سنسکرت سے بھی ملتا ہے۔ پنجاب ہمیشہ عظیم صوفی بزرگوں کا مسکن اور مشہور جنگجوؤں کا صوبہ رہا ہے۔

پنجابیوں کے مرد و خواتین کے کچھ مخصوص پہناوے ہیں جو کہ روایتی ہونے کے ساتھ ساتھ نفاست کے باعث پنجاب کے علاوہ بھی تمام ممالک کے مرد و زن میں یکساں مقبول ہیں اور اپنے مخصوص علاقائی ذوق و شوق کے مطابق پہنے جاتے ہیں اور ان کو روایتی طور پر بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان ملبوسات کی تفصیل قارئین کی نظر ہے:

لباس کسی مخصوص علاقے کے کلچر اور طرز زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ پہناوے مجموعی طور پر کسی قوم کی نشاندہی کرتے ہیں، حتیٰ کہ کپڑوں کا فیبرک، سلائی کڑھائی، تراش خراش بخوبی جغرافیائی حدود کا تعین کر سکتے ہیں۔

پنجاب کے مردوں کے لباس میں پگڑی، کرتا اور دھوتی شامل ہے، جبکہ عورتیں عموماً شلوار قمیض اور دوپٹہ پہننا پسند کرتی ہیں۔

پگڑی:۔

پنجاب کے مردوں کے پہناوے کی خاصیت پگڑی ہوتی ہے اور پگڑی کا یہ رواج سکھوں سے بھی لیا گیا ہے۔ دیہی علاقوں میں آج بھی پگڑی بزرگی کی علامت سمجھی جاتی ہے اس کو پگ یا ترنجن بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ان سلا سادہ کپڑا ہوتا ہے جسے پنجابی مرد سر پر باندھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ پگڑی کو مختلف علاقوں کے لوگ ایک مخصوص طریقے سے باندھتے ہیں اور اسے عزت و توقیر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

کرتا:۔

کرتے کی تاریخ گیا رھویں صدی سے ملتی ہے۔ ابتداء میں کرتے کو بٹنوں سے باندھا جاتا تھا اور اس کی لمبائی ٹخنوں تک رکھوائی جاتی تھی۔ کرتا عموماً دھوتی کے ساتھ پہنا جاتا تھا اور بعض لوگ اسے شلوار کے ساتھ بھی پہنا کرتے تھے۔ آج کل مرد حضرات جینز کے ساتھ بھی کرتے پہنے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ لڑکے چوڑی دار پاجامے اور چنٹ والی شلوار کے ساتھ بھی کرتے پہنتے ہیں۔ مگر موجودہ دور میں کرتوں کی لمبائی میں کمی بیشی معمول کا حصہ بن چکی ہے، یہاں تک کہ ہیروں تک نے لیے کرتے بھی فیشن کا حصہ رہے ہیں۔

کرتے کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لئے ان پر بٹن لگوائے جاتے ہیں۔ پرانے زمانے میں امراء یہ بٹن سونے اور چاندی کے بھی لگواتے تھے۔

دھوتی:۔

دھوتی پہننے کا چلن مرد و خواتین میں یکساں رائج تھا۔ دھوتی بھی ان لیے کپڑے کی بنائی جاتی ہے جو کہ تقریباً 7 گز لمبا ہوتا ہے، اور یہ کمر کے گرد باندھی جاتی ہے۔ دیہی علاقوں کے بااثر لوگ اسے عموماً سفید کرتے کے ساتھ پہنتے ہیں۔ دھوتی کا کپڑا سادہ ہونے کے ساتھ مختلف ڈیزائنز کا بھی بنا ہوتا ہے، اس کے لئے خصوصی طور پر مختلف رنگوں کی لائنز اور ڈیوں والا کپڑا استعمال ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں دیہی علاقوں میں آج بھی اس کا استعمال بخوبی ہوتا ہے جبکہ شہروں میں مختلف ثقافتی میلوں پر پنجابی گلوکار کی مکاسی کے لئے اسے پہنا جاتا ہے۔

پنجابی خواتین کی ڈریسنگ بھی منفرد اور خوبصورت ہوتی ہے کیونکہ وہ مختلف رنگوں کے امتزاج سے ایک جوڑا بناتی ہیں جو کہ تقاریب کے علاوہ معمول میں بھی حسین لگتا ہے۔ اپنے ڈریس کو یہ مختلف طریقوں سے بناوتی نظر آتی ہیں۔ کبھی کرتے کے لیے، کبھی ان کی لمبائی چھوٹی اور درمیانی رکھوائی جاتی ہے اور شلوار کو سلوانے کے مختلف و منفرد طریقے اپنائے جاتے ہیں جن میں سادہ کھلے پائچے والی شلوار، پٹیالہ یا دھوتی شلوار اور مختلف طریقوں سے ٹراؤزر بھی سلوائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ چوڑی دار پاجامہ بھی انہی کرتوں کے ساتھ معقول ہے، جو معمول کے علاوہ بھی مختلف تقاریب میں پہنا جاتا ہے۔ خواتین میں کرتوں پر خوبصورتی بڑھانے کے لئے کڑھائی کروائی جاتی ہے اور پنجابی خواتین عموماً پھلکاری کرواتا پسند کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ گوٹے کناری کا کام، لیس اور پیڈز وغیرہ لگا کر بھی فیشیس بنوائی جاتی ہیں۔ کرتا، شلوار، دوپٹہ، چھم، لنگی، پنجابی کھسا، کھرا، لاچا اور جیکٹ کے ساتھ بھی پہنا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کرتوں کی مختلف اقسام بھی ہیں جن میں ملتانی کرتا، ملتانی کڑھائی نفاست اور انفرادیت میں قدیم ثقافت کی مکاسی کرتی ہے پنجابی پھلکاری کرتا، پنجابی باندھنی کرتا، کھسری کرتا شامل ہے۔

ملتانی کڑھائی کے مشینی دور میں بھی اس کڑھائی کی اپنی حیثیت ہے۔ اس کڑھائی میں سوئی دھاگے سے مختلف رنگوں کے دھاگوں کو خوبصورتی کے ساتھ جوڑ کر لباس میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مقامی ابرک کی نقاشیاں بھی کرتوں پر استعمال کی جاتی ہیں۔ ملتانی شلوار بھی خواتین میں بہت پسند کی جاتی ہے۔ اس کو عام طور پر گھیر والی یا سرائیکی گھیر والی شلوار کہا جاتا ہے۔ یہ پہننے میں کافی زیادہ کھلی ہوتی ہے اور یہ پنجاب میں ملتان کے ارد گرد کے علاقوں میں مقبول ہے۔ ملتانی شلوار دھاگا استعمال ہوتا ہے اور شلوں، دوائروں کی صورت میں کڑھائی کی جاتی ہے۔ عموماً پنجابی خواتین گھروں میں اپنے کپڑوں پر خود پھلکاری کرتی ہیں اور بعض اوقات فیشیس اور مختلف کپڑوں پر یہ کڑھائی کر کے مارکیٹس میں فروخت بھی کرتی ہیں۔

ابتداء میں پنجابی خواتین پھلکاری سے اتنی جڑی تھیں کہ اس دور کے لوگ گیتوں میں بھی اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔

پنجابی باندھنی کرتا، پنجاب کے صحراؤں میں مشہور ہے، جس میں باندھنی باندھ کر کپڑے کو رنگوایا جاتا ہے۔ اس کے دو پنے اور کرتے دونوں موجودہ دور میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔

کھسری کرتا روایتی پنجابی کرتوں کی طرح کھلا اور لمبائی میں ٹخنوں تک ہوتا ہے۔ یہ کرتا اپنی خوبصورتی کے باعث ہر دور میں پہنا جاتا ہے اور دور جدید میں بھی خواتین اسے پہننا پسند کرتی ہیں۔

پنجابی شلوار سوٹ:۔

پنجابی شلوار سوٹ پنجاب کی خواتین کا روایتی لباس ہے۔ یہ کرتا اور سادہ شلوار پر مشتمل ہوتا ہے۔ پنجابی شلوار سوٹ افغانی اور ملیشیا لباس سے قدرے مختلف ہوتا ہے، اس میں اوپر سے کھلی اور ٹخنوں سے تنگ شلوار پہنی جاتی ہے اور کرتے میں دونوں اطراف کٹ لگے ہوتے ہیں جنہیں چاک کہا جاتا ہے۔ چھوٹی قمیض کے ساتھ پٹیالہ یا دھوتی شلوار کا استعمال بھی بخوبی کیا جاتا ہے۔ پنجابی شلوار سوٹ پنجاب کے علاوہ بھی مختلف جگہوں میں ذوق و شوق سے پہنا جاتا ہے۔ مزید برآں روزمرہ ڈریسنگ میں شلوار قمیض کو فوقیت دی جاتی ہے۔ اس کو آرام دہ بھی تصور کیا جاتا ہے اس لئے دیہی علاقوں کے ساتھ ساتھ شہری علاقوں کے لوگ بھی اسے پہننا پسند کرتے ہیں۔

پنجابی گھاگھرا:۔

پنجابی سوٹ سے پہلے پنجابی گھاگھرا پنجابی خواتین کا مقبول پہناوا ہوا کرتا تھا۔ تاہم دور جدید میں یہ عموماً چھوٹی کرتی کے ہمراہ تقریبات پر زیب تن کیا جاتا ہے۔

پنجابی لاچا:۔

پنجابی روایت کے مطابق خواتین چھوٹی کرتی کے ساتھ لاچا بھی پہنتی ہیں۔ یہ تہہ کی ہی ایک قسم ہوتی ہے لیکن تہہ ایک رنگ کا اور اس کا گھیر اتنیں ہوتا جبکہ لاچے کا گھیر زیادہ ہوتا ہے اور یہ مختلف رنگوں سے بنایا جاتا ہے۔

سندھی پہناوے "کھبا" سے مماثلت رکھتی ہے۔ یہ دونوں انداز عراق پھیلاؤ میں زیادہ سے زیادہ ہیں۔ ملتانی شلوار کھل پنجابی قمیض اور چولا ریب تن کیا جاتا ہے۔ پنجابی پھلکاری کرتے پر کے علاوہ بھی مختلف تقاریب میں پہنا جاتا ہے۔ خواتین میں کرتوں پر

> **پنجابیوں کے مرد و خواتین کے کچھ مخصوص پہناوے ہیں جو کہ روایتی ہونے کے ساتھ ساتھ نفاست کے باعث پنجاب کے علاوہ بھی تمام ممالک کے مرد و زن میں یکساں مقبول ہیں۔**

پنجابی تہواروں اور مقامی تقریبات کے موقع پر مختلف اقسام کے لباس زیب تن کئے جاتے ہیں۔ مختلف روایتی ملبوسات کے ساتھ مخصوص طرز کے زیورات پہننے کا رواج بھی عام ہے۔

روایتی زیورات:۔

پنجابی خواتین اکثر اپنے رنگ برنگے کپڑوں کے ساتھ سونے کے زیورات پہننے کو ترجیح دیتی ہیں۔ خاص طور پر شادی بیاہ کی تقریبات پر یہ رنگ برنگی کانچ کی چوڑیاں، گلے کا ہار، جھمکیاں یا کوکا، بازیب اور بڑے جھمکے پہنتی ہیں۔

جوتیاں یا کھسے:۔

کھسے پنجاب میں خصوصی نفاست سے تیار کئے جاتے ہیں۔ مردانہ کھسوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی تلے والے کھسے اور تلے والی جوتیاں پہنتے جبکہ خواتین بھی تلے والی اور کولاپوری جوتیوں کے ساتھ ساتھ سادہ اور نفیس کام والے کھسے پہنتی دکھائی دیتی تھیں۔ موجودہ دور میں کولاپوری جوتی اور کھسے کا فیشن واپس رواج پا گیا ہے اور مرد و زن انے بخوبی پہنتے ہیں۔

روایتی پنجابی لباس کے ساتھ خواتین پراندہ بھی استعمال کرتی تھیں۔ عام طور پر کالے جبکہ شادی بیاہ کی تقریبات پر لال اور دوسرے گہرے رنگوں کے پراندے پہنے جاتے تھے۔

اس کے علاوہ ان پر مختلف اقسام کے ہیڈز لگا کر بھی ان کی خوبصورتی میں اضافہ کیا جاتا تھا۔ موجودہ دور میں پراندوں کا استعمال کم ہو گیا ہے البتہ دیہی علاقوں کی خواتین آج بھی ان کا استعمال کرتی ہیں۔

دوپٹہ جس کو پنجابی میں "چنی" کہا جاتا ہے۔ خواتین انہیں ہر طرح کے کپڑوں کے ساتھ اوڑھتی ہیں۔ اس کو شلوار قمیض کے ساتھ ہینگ کر کے پہنا جاتا ہے اور مزید خوبصورت بنانے کے لئے لیس اور مختلف طرز کا کام کروایا جاتا ہے۔ پنجاب کے روایتی لباس میں پنجابی ثقافت کی تصویر دکھائی دیتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ پنجاب کے تمام پہناوے روایت اور رسم کی حسین امتزاج ہیں اور پوری دنیا میں اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی کی ابتداء تک پنجاب میں سوتی کپڑوں کی صنعت عروج پر تھی اور اس سے پنجابی ملبوسات میں نئے طرز کے لباس متعارف کروائے جاتے رہے۔ جدید تراش خراش کے یہ لباس وقت کے ساتھ ساتھ پنجابیوں کی تہذیب اور ان کی خوش ذوقی کی علامت بن گئے۔

26-3-15
روزنامہ

محمود الحسن
تصاویر: شہباز ملک

نذیر انبالوی کے قلم سے مختلف اخبارات ورسائل میں چھپنے والے چند مشہور مستقل سلسلے جن میں سے ''نعت کہانی'' کے سوا تمام کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں

☆ایک قول ایک کہانی
☆خبر کہانی
☆نعت کہانی
☆دوسری دفعہ کا ذکر ہے
☆حدیث کہانیاں
☆آیت کہانیاں
☆اسکول کہانی
☆فاتح (ناول)

کتابیں

☆ہوا زندہ رہے گی
☆آزادی جندہ باد
☆وہ کون تھا؟
☆سنہری کرن
☆ایک ادیب ایک کہانی

بروز جمعرات 26 مارچ 2015
روزنامہ ایکسپریس



بچوں کے ادب اور ادیبوں پر تحقیق و تنقید نہ ہونے کے برابر ہے، حکومت اکادمی ادبیات اطفال قائم کرے

ادب میں مقصدیت کا قائل ہوں لیکن تحریر کو فنی تقاضے بھی پورے کرنے چاہئیں

سرِ بات دوستوں سے گفتگو بچوں کے لیے لکھنا بچوں کا کھیل نہیں، نامور ادیب نذیر انبالوی سے مکالمہ





محمود الحسن: نذیر انبالوی کا کہنا ہے، جس معاشرے میں بچوں کا ادب ہی طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا ہو، وہاں کسی ادیب کو نظر انداز کردینا کس شمار قطار میں ہوگا، یہ حقیقت اپنی جگہ لیکن وہ سمجھتے ہیں، سید نظر زیدی کو نظر انداز کیا گیا اور ان کی خدمات کے اعتراف میں بخل سے کام لیا گیا۔ ان کی دانست میں سعید لخت نے بھی ادب الاطفال کے لیے پوری زندگی وقف کی لیکن ان کو بھی وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ جاحظ میں بچوں کے ادب اور ادیبوں پر مقالے لکھوانے کے گریز کو وہ تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ کتنے ہی رسالے تین برس مدیر رہے۔ اس حیثیت میں کئی نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا۔ اپنے لکھے کو ہی عزیز نہیں جانتے بلکہ دوسروں کی نگارشات بھی دھیان میں رہتی ہیں، اس لیے گذشتہ بارہ سالوں سے ہر برس بچوں کے رسالوں میں چھپنے والی کہانیوں کا انتخاب شائع کررہے ہیں۔ گیارہ برس کنول ادارہ تحقیق ادب اطفال قائم کیا۔ ناموں سے نہیں گمنام لکھنے والوں سے بھی تعلق خاطر ہے، کچھ مرحوم قلم صفاتات میں بیٹھے ان قلم کاروں کے باب میں، جو بچوں کے لیے لکھتے لکھتے اچانک منظر سے ہٹ گئے، ''گوہر نایاب'' کے عنوان سے سلسلہ لکھا۔ ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے مقصدیت کے قائل ہیں۔ ادب میں ہر ہم چند کو اپنا رہنما مانتے ہیں۔ آخویں جماعت میں پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ ''زادِ راہ'' اتنا پسند آیا کہ پھر اس ادیب کی باقی تحریروں کو بھی چاٹ ڈالا، جس کے ہاں وہ دیکھتے ہیں، کہانی میں فن لوازمات اور مقصدیت پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ اس اصول کو انھوں نے اپنا رہنما اس وقت بنایا جب لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔

بچوں کا ادب تخلیق کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ یہ وہ بات ہے، جو عام طور پر دہرائی جاتی ہے۔ اس بارے میں ان کا موقف جاننا چاہا تو کہا یہ بات ٹھیک ہے کیونکہ ''بچوں کا ادب جب آپ تخلیق کرتے ہیں، تو ان کی عمر کو ذہن میں رکھ کر لکھنا پڑتا ہے۔ مختلف عمر کے بچوں کے لیے الگ اسلوب بنانا پڑتا ہے۔ چند گنے چنے موضوعات پر ہی لکھنا ہوتا ہے۔ زبان پر قدرت ہونی چاہیے۔ کہانی کا مقصد زبان سکھانا بھی ہوتا ہے، اور زبان کے ذریعے سے بچوں کو راغب کرنا بھی۔ اس لیے موضوع سے لے کر اسلوب تک بڑے نازک مراحل سے گزر کر آپ یہ ادب تخلیق کرتے ہیں۔''

نذیر انبالوی نے لکھنے سے پہلے اور اس عمل کے دوران بھی مطالعہ سے واسطہ رکھا۔ قلم میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور حفیظ جالندھری سے متاثر ہوئے تو نثر میں سعید لخت کے طرزِ تحریر سے بہت کچھ سیکھا۔ ان اصحاب سے ہٹ کر بچوں کے جن ادیبوں کی تحریروں سے اکتساب کیا ان میں میرزا ادیب، حکیم سعید، مسعود احمد برکاتی، سیدہ نظر زیدی، حسن ذکی کاظمی، عزیز اثری، اشتیاق احمد، ذکیہ بلگرامی اور خالد بزمی کا نام لیتے ہیں۔

نذیر انبالوی کا کہنا ہے، جس معاشرے میں بچوں کا ادب ہی طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا ہو، وہاں کسی ادیب کو نظر انداز کردینا کس شمار قطار میں ہوگا، یہ حقیقت اپنی جگہ لیکن وہ سمجھتے ہیں، سید نظر زیدی کو نظر انداز کیا گیا اور ان کی خدمات کے اعتراف میں بخل سے کام لیا گیا۔ ان کی دانست میں سعید لخت نے بھی ادب الاطفال کے لیے پوری زندگی وقف کی لیکن ان کو بھی وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ جاحظ میں بچوں کے ادب اور ادیبوں پر مقالے لکھوانے کے گریز کو وہ تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ کتنے ہی رسالے تین برس مدیر رہے۔ اس حیثیت میں کئی نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا۔ اپنے لکھے کو ہی عزیز نہیں جانتے بلکہ دوسروں کی نگارشات بھی دھیان میں رہتی ہیں، اس لیے گذشتہ بارہ سالوں سے ہر برس بچوں کے رسالوں میں چھپنے والی کہانیوں کا انتخاب شائع کررہے ہیں۔ گیارہ برس کنول ادارہ تحقیق ادب اطفال قائم کیا۔ ناموں سے نہیں گمنام لکھنے والوں سے بھی تعلق خاطر ہے، کچھ مرحوم قلم صفاتات میں بیٹھے ان قلم کاروں کے باب میں، جو بچوں کے لیے لکھتے لکھتے اچانک منظر سے ہٹ گئے، ''گوہر نایاب'' کے عنوان سے سلسلہ لکھا۔ ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے مقصدیت کے قائل ہیں۔ ادب میں ہر ہم چند کو اپنا رہنما مانتے ہیں۔ آخویں جماعت میں پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ ''زادِ راہ'' اتنا پسند آیا کہ پھر اس ادیب کی باقی تحریروں کو بھی چاٹ ڈالا، جس کے ہاں وہ دیکھتے ہیں، کہانی میں فن لوازمات اور مقصدیت پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ اس اصول کو انھوں نے اپنا رہنما اس وقت بنایا جب لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔

بچوں کا ادب تخلیق کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ یہ وہ بات ہے، جو عام طور پر دہرائی جاتی ہے۔ اس بارے میں ان کا موقف جاننا چاہا تو کہا یہ بات ٹھیک ہے کیونکہ ''بچوں کا ادب جب آپ تخلیق کرتے ہیں، تو ان کی عمر کو ذہن میں رکھ کر لکھنا پڑتا ہے۔ مختلف عمر کے بچوں کے لیے الگ اسلوب بنانا پڑتا ہے۔ چند گنے چنے موضوعات پر ہی لکھنا ہوتا ہے۔ زبان پر قدرت ہونی چاہیے۔ کہانی کا مقصد زبان سکھانا بھی ہوتا ہے، اور زبان کے ذریعے سے بچوں کو راغب کرنا بھی۔ اس لیے موضوع سے لے کر اسلوب تک بڑے نازک مراحل سے گزر کر آپ یہ ادب تخلیق کرتے ہیں۔''

نذیر انبالوی نے لکھنے سے پہلے اور اس عمل کے دوران بھی مطالعہ سے واسطہ رکھا۔ قلم میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور حفیظ جالندھری سے متاثر ہوئے تو نثر میں سعید لخت کے طرزِ تحریر سے بہت کچھ سیکھا۔ ان اصحاب سے ہٹ کر بچوں کے جن ادیبوں کی تحریروں سے اکتساب کیا ان میں میرزا ادیب، حکیم سعید، مسعود احمد برکاتی، سیدہ نظر زیدی، حسن ذکی کاظمی، عزیز اثری، اشتیاق احمد، ذکیہ بلگرامی اور خالد بزمی کا نام لیتے ہیں۔

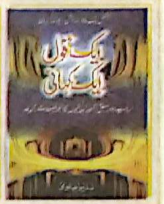
نذیر انبالوی کا کہنا ہے، جس معاشرے میں بچوں کا ادب ہی طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا ہو، وہاں کسی ادیب کو نظر انداز کردینا کس شمار قطار میں ہوگا، یہ حقیقت اپنی جگہ لیکن وہ سمجھتے ہیں، سید نظر زیدی کو نظر انداز کیا گیا اور ان کی خدمات کے اعتراف میں بخل سے کام لیا گیا۔ ان کی دانست میں سعید لخت نے بھی ادب الاطفال کے لیے پوری زندگی وقف کی لیکن ان کو بھی وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ جاحظ میں بچوں کے ادب اور ادیبوں پر مقالے لکھوانے کے گریز کو وہ تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ کتنے ہی رسالے تین برس مدیر رہے۔ اس حیثیت میں کئی نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا۔ اپنے لکھے کو ہی عزیز نہیں جانتے بلکہ دوسروں کی نگارشات بھی دھیان میں رہتی ہیں، اس لیے گذشتہ بارہ سالوں سے ہر برس بچوں کے رسالوں میں چھپنے والی کہانیوں کا انتخاب شائع کررہے ہیں۔ گیارہ برس کنول ادارہ تحقیق ادب اطفال قائم کیا۔ ناموں سے نہیں گمنام لکھنے والوں سے بھی تعلق خاطر ہے، کچھ مرحوم قلم صفاتات میں بیٹھے ان قلم کاروں کے باب میں، جو بچوں کے لیے لکھتے لکھتے اچانک منظر سے ہٹ گئے، ''گوہر نایاب'' کے عنوان سے سلسلہ لکھا۔ ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے مقصدیت کے قائل ہیں۔ ادب میں ہر ہم چند کو اپنا رہنما مانتے ہیں۔

ستمبر میں یوم دفاع اسی طرح قائداعظم اور علامہ اقبال کے یوم پیدائش و وفات پر خصوصی مضامین۔ ان موضوعات پر ہر سال کچھ نہ کچھ دینا ہوتا ہے، اس لیے موضوعات کی یکسانیت کے باوجود آپ نے کام کرنا ہوتا ہے۔ قوت فیصلہ ہونی چاہیے تاکہ چیزوں کے رد و قبول کا فیصلہ جلدی ہو سکے۔''

بچوں کے رسالے کا مدیر ہونا ایک ایسا تجربہ رہا، جس سے لطف اندوز بھی ہوئے، اور پاؤ بھی محسوس کیا۔ ان کا کہنا ہے، ادارت کے باعث تخلیقی کام خاصا متاثر ہوا ہے، اس لیے وہ تعلیم و تربیت سے الگ ہو گئے۔ 21 برس سے تدریس سے متعلق نذیر انبالوی سمجھتے ہیں کہ تدریس کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا عمل زیادہ بہتر اور منظم انداز میں آگے بڑھ سکتا ہے۔ مگر میوں کی چھٹیوں کا انھیں انتظار رہتا ہے، تاکہ اطمینان سے کام مکمل کرسکیں اور کچھ نیا بھی تخلیق کرسکیں، باقی کام تو ساتھ ساتھ جاری رہتا ہی ہے۔ 24 دسمبر 1965ء کو لاہور میں آنکھ کھولنے والے نذیر انبالوی نے اورینٹل کالج سے ایم اے اردو کیا۔ وہاں پڑھاتے بھی انھیں بہت یاد آتا ہے۔ ڈاکٹر حسین فراقی اور کمیل احمد خان جیسے اساتذہ سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا لیکن جس استاد نے ان کی سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کی اور بچوں کے لیے لکھنے کی ان کی صلاحیت کا برملا اعتراف کرکے مان بڑھایا وہ رفیع الدین ہاشمی ہیں، جن سے رہنمائی کا سلسلہ دس برس تک چھوڑ دینے کے بعد بھی جاری رہا۔ ایم اے او کالج میں حفیظ صدیقی نے سے بہت کچھ جانا۔ بچوں کے رسائل و جرائد میں دارالاشاعت پنجاب کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ''پھول'' کے بہت قائل ہیں، جس نے ان کے خیال میں کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ بڑے نامور ادیبوں نے اس کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''پھول'' کا ایک انتخاب نامور ادیب غلام عباس نے بھی کیا، جو اس پرچے کے مدیر بھی رہے۔ مستقبل میں وہ ''پھول'' کا ایک مفصل انتخاب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ''پھول'' کے بعد وہ پرچہ جس نے لوگوں کو متوجہ کیا اور ان کے لفظوں میں بچوں کے دلوں پر دستک دی، وہ تعلیم و تربیت ہے۔ ''نونہال'' کے کردار کو بھی ناقابل فراموش گردانتے ہیں۔ پسندیدہ پرچوں میں ''آنکھ مچولی'' کا نام بھی لیتے ہیں، جو 1986ء سے 1998ء تک شائع ہوتا رہا۔ اشاعت کے اعتبار سے یہ مرصع لیکن اثرات کے لحاظ سے وسیع ہے۔ نذیر انبالوی کے بقول: ''آنکھ مچولی'' اس کے ذکر کے بغیر بچوں کے رسائل کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ ان کے بقول ''آنکھ مچولی کو میں بچوں کا پہلا بالغ پرچہ کہتا ہوں۔ بڑی معیاری کہانیاں اس میں شائع ہوئیں۔ اس کے خاص نمبر خاصے کی چیز تھے، جن میں سے بہت سے ایسی چیزیں شامل تھیں، جو آج بھی لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ ڈاکٹر طاہر مسعود اور ڈاکٹر سلیم مغل اس کے مدیر تھے۔ ان دونوں نے مجھے ہوئے لکھنے والوں

لیکن لکھنے کی طرف وہ کسی منصوبہ بندی سے نہیں آئے، بس ایک اتفاق انھیں اس طرف لے گیا۔ نویں جماعت میں تھے، جب ایک روز بس میں ساتھ بیٹھے مسافر سے ''واۓ وقت'' کا بچوں کا میگزین ''پھول اور کلیاں'' پڑھنے کو لیا تو پھر اسے پڑھتے چلے گئے اور اس حد تک متاثر ہوئے کہ اخبار کے دفتر جا کر صفحے کے انچارج سے ملنے پہنچ گئے اور اپنی پسندیدگی سے آگاہ کیا۔ بھلے مانس اطہر ہاشمی نے ان سے نام پتا پوچھا اور کہا بس آئندہ ہفتے کا ''پھول اور کلیاں'' ضرور دیکھنا ہے۔ حسب الارشاد اگلے ہفتے کا شمارہ دیکھا تو اس میں شائع ہونے والے

یہ پہلا موقع تھا، جب اپنا نام چھپا ہوا انھوں نے دیکھا۔ بار بار اس نام کو پڑھا۔ گھر میں سب کو اپنا چھپا نام دکھایا۔ اس سارے سے جو حوصلہ افزائی ہوئی، اس نے انھیں قلم اٹھانے پر اُبھارا۔ چند دن بعد کاغذ قلم لے کر بیٹھے اور محنت کا پھل کے عنوان سے کہانی لکھی اور نوے وقت دے آئے، جو 15 جولائی 1981ء میں شائع ہوئی، تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور آخری خبریں آنے تک کامیابی سے جاری و ساری ہے۔ اس ساری بات سے اخبارات میں بچوں کے صفحے کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے، اس لیے وہ خطوط میں یہ خط بھی تھا ''نذیر انبالوی، اچھرہ، لاہور نے بھی پھول اور کلیاں کو بہت پسند کیا ہے۔







نذیر انبالوی سمجھتے ہیں کہ سینئر سے تو آپ سیکھتے ہی ہیں، لیکن بعض اوقات جونیئر کی تحریر میں بھی سیکھنے کو مل جاتا ہے۔ وہ اس سوچ کے حامی نہیں کہ بچوں کا ادب بچے ہی تخلیق کرسکتے ہیں۔ کہتے ہیں، اکثر ادیبوں نے بچپن ہی میں لکھنے کا آغاز کیا۔ نذیر انبالوی نے ایک قومی روزنامے میں ایک قول ایک کہانی کے عنوان سے سلسلہ شروع کیا تو وہ خاصا متبول ہوا اور ساڑھے چھ برس چلتا رہا۔ اس کے بعد بچوں کی کردار سازی کے لیے احادیث نبوی پر مبنی ''ایک حدیث ایک کہانی'' کے عنوان سے ان کے کام کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ان کے بقول ''2001ء میں نماز پڑھنے مسجد میں گیا تو وہاں پر دیوار پر ایک کاغذ آویزاں دیکھا، جس پر ''چہل حدیث'' لکھا تھا۔ وہ ساری احادیث روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل سے متعلق تھیں، تو میں نے سوچا کہ ان احادیث کو بھی کہانیاں لکھی جاسکتی ہیں۔ چند دن بعد یہ حدیث نظر سے گزری ''رسول اکرم ﷺ نے فرمایا، میری امت میں جس شخص نے چالیس حدیثیں حفظ کیں، میں قیامت کے دن اس شخص کی سفارش کروں گا۔'' بس اس کے بعد میں نے احادیث مبارکہ پر کہانیاں لکھنے کے خیال کو عملی صورت دینے کا تہیہ کرلیا۔ یہ کہانیاں کتابی صورت میں آنے سے قبل معروف رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔ ''اس کام کی پذیرائی نے انھیں بچوں کے لیے آیات مبارکہ پر مبنی کہانیاں لکھنے کی راہ سجھائی، اور انھوں نے ایک آیت ایک کہانی کا سلسلہ شروع کیا تو وہ بھی متبول ہوا۔ اس کام کے دوران وہ علماء سے رہنمائی لیتے رہے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے صرف ان آیات اور احادیث کو چنا، جو بچوں سے متعلق تھیں۔ نذیر انبالوی کو پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا

انھیں فوٹو گیلریوں کے لیے نرسری قرار دیتے ہیں، جہاں ان کی بچی کچی تحریریں شائع ہوتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ تحریر میں پختگی آتی جاتی ہے۔ اخبارات میں بچوں کے حوالے سے جو کچھ ماضی میں چھپتا رہا ہے یا جو کچھ حال میں چھپ رہا ہے، ان کی اس پر گہری نظر ہے۔ امروز میں ''بچوں کی دنیا'' کے عنوان کے زیرِ تحت عزیز اثری جو ہفت روزہ صنو نکالتے، اس کو اپنی مثال آپ قرار دیتے ہیں۔

موجودہ دور میں ''ایکسپریس'' کے بچوں کے لیے ہفتہ وار صفحے ''کرنیں'' کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے ''بچوں کے لیے اخبار سے الگ چیز ہونی چاہیے، جسے بچہ اپنی طبیعت کے مطابق پڑھے۔ یہ وہ صاحب ہیں، جنھوں نے ''سونا چاندی نہ کوئی لعل جان من تھا کو میں دے سکوں گا'' جیسا مشہور گیت لکھا۔ ایک روز سعید گیلانی نے ان سے کہا کہ فلم اٹھ مسٹری روبہ زوال ہے، اس لیے ان کو اب ہمیں کوئی مستقل نہیں، لہٰذا اپنے وقت کا زیادہ بہتر استعمال کریں اور تو جہ اب پر مرکوز کردیں۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی اور پھر فاخوں میں جانے کا سلسلہ موقوف ہوا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسکولوں سے بزمِ ادب ختم کردینے سے بہت نقصان ہوا، جس کے ذریعے بچوں میں ادب کا ذوق جگایا جاتا تھا۔ کتابوں اور رسالوں کو بھی تعلیمی اداروں میں خاص اہمیت نہیں دی جاتی جس سے نئی نسل میں پڑھنے لکھنے کا رجحان پڑھنے کے بجائے گھٹا۔

ہمارے معاشرے میں جس بگاڑ نے سب سے زیادہ مسائل پیدا کیے ہیں، وہ یہاں سے اچھائی برائی کی تمیز کا اٹھ جانا ہے۔ نذیر انبالوی کو اس صورتحال کا ادراک ہے، نیگی بدی کے تصور کی وضاحت کے لیے کئی کہانیاں ان کے قلم سے نکلیں، جن پر مشتمل مجموعے ''نیکی کی کہانی'' کو نیشنل بک فاؤنڈیشن'' نے انعام بھی دیا۔ اسکول میں ہزار طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں، ان سے متعلق نذیر انبالوی کی کتاب اسکول کہانی بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بچوں کے ادب سے محبتوں کی بے انتہائی انھیں پریشان کرتی ہے۔ ان کے بقول ''میرے خیال میں بچوں کے ادب کے فروغ کے لیے اکادمی ادبیات اطفال کے نام سے ادارہ ہونا چاہیے۔ بچوں کے ادیبوں کے لیے حکومت الگ سے ایوارڈ کا اعلان کرے۔ جامعات میں اس ادب سے متعلق تحقیق و تحقیق کو ممکن بنایا جائے۔'' ''ڈھونڈا کیڈمی شعبہ بچوں کا ادب'' کے فروغ ادب میں کردار کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ مستقبل میں ایک ہزار کہانیوں کا ایسا انتخاب کرنے کے خواہاں جو سو سو کہانیوں پر مشتمل دس جلدوں میں آجائے۔ ان کا اصل نام نذیر الحسن ہے، بزرگوں کا تعلق انبالہ سے تھا، اس مناسبت سے انبالوی نام کا حصہ بنالیا۔ زندگی میں ملنے والی کامیابیوں کو والدین کی دعاؤں کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ لکھنے کے لیے گھر سے باہر کھلی فضا کو وہ اپنے لیے آئیڈیل جانتے ہیں، ان کی بیشتر کہانیاں کھلے میدان میں بیٹھ کر لکھی گئی ہیں۔



مبین مرزا

اُردو نعت کی شعری روایت



حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک مسلمان کی زندگی کا سرِ اسرفی محور ہے، یہ اہم سوالہ ہے۔ اس معاملے کی اہمیت کا انحصار اس امر پر نہیں کہ یہ مسلمان اپنے عقائد کے عمل رویوں پر کس حد تک کاربند ہے، بلکہ ایمان و یقین کے اس نکتے پر ہے کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر اُس کے عقائد اس درجہ ناقص ہیں کہ باقی اعمال کی توثیق اور بجا آوری کے باوجود وہ کامل ایمان والا مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرِ اسرفی معاملہ ہونے کے باوجود عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اثبات و اظہار فرد کی ذاتی زندگی سے لے کر اُس کے سماجی اور تہذیبی وجود تک شعور کی ہر تمکنت سطح پر ہوتا ہے۔ اسلام کی چودہ سو سال سے زائد عرصے کو محیط تاریخ پر ایک اجمالی نگاہ ڈال کر بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب، تہذیب، سیاست، قومیت اور دینی حمیت کے جس میدان نے بھی اہلِ اسلام سے جب عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی طلب کی تو اوّلیں سطح پر سماجی اور اعمال کے معاملے میں برائے نام مذہبی زندگی گزارنے والے مسلمان نے بھی دامے درمے قدمے سخنے جی جان سے اس شہادت کو اپنے لیے اعزاز جانا۔ شاید ہی رسول کی دعلت کا باب ماضی کے دستان سے حصر حاضر کے تنِ تقریحہ جو تشنہ پیش کرتا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال ادب، تہذیب اور مذہب تینوں حوالوں سے تاریخ عالم کے کسی باب میں اس طرح نہیں ملتی۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ آخر ایسا کیا معاملہ ہے جو اس رویے اور جذبے کے اظہار کی بنیاد بنتا ہے؟ ہم اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مسلمانوں کا جذبۂ محبت بھی کہہ سکتے ہیں۔

تاہم یہ جواب ناکافی ہوگا۔ اس لیے کہ حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار تاریخ اسلام نے محض عام آدمی کے یہاں ریکارڈ نہیں کیا، بلکہ اہلِ تعلیم یافتہ اذہان اور معاشرے کے اہم سنجیدہ شعبوں سے وابستہ افراد کے یہاں بھی اس کا وفور اسی سطح پر دیکھا گیا ہے۔ بادی کیا جانا چاہیے کہ یہ جذبہ تو ہے ہی، لیکن اس کے سوا بھی کچھ ہے جو معاشرے کے مختلف طبقات میں یکساں کیفیت کے ساتھ اس ضمن میں جاذبیت اور وارفتگی کی بنیاد بنتا ہے — اور وہ ہے سیرتِ مطہرہ کی صورت اُبھرنے والا انسانی کردار۔ یہی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انا بشر مثلکم

(میں تمھاری ہی طرح کا انسان ہوں۔)

یہ بیان فکر انگیز ہے۔ قرآنِ کریم میں ہبوطِ آدم کا واقعہ، فرشتوں کا آدم کو سجدہ، آدم کی فضیلت اور انسانیت کے فوز و فلاح کے لیے انبیائے کرام علیہم السلام کی ضرورت سے لے کر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک کے حقائق پر غور کیا جائے تو اس بیان کی معنویت کا انکشاف ہوتا ہے۔ نبوت کے باب کی تکمیل کا مطلب صرف یہیں ہے کہ باری تعالیٰ نے نبوت کا باب بند کر دیا اور اب باقی انبیا تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ یہ بات تو اپنی جگہ حقیقت ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ خاتم النبیین کا مفہوم یہ بھی ہے کہ اس صفت میں نبوت تکمیل کے اس درجے تک لایا گیا ہے کہ اس کے بعد کسی دوسرے نبی کی گنجائش یا ضرورت ہی نہیں رہے گی، یعنی نبوت کی تکمیل سے مراد نبوت کے کردار کا باندر ترین اظہار ہے۔ یعنی اس کردار کی معراج۔ چناں چہ ختمِ نبوت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ انسانی فوز و فلاح کے کام کا وہ حتمی صفت ہے، جس تک انسان اور اس کا عمل کمال تک پہنچایا گیا کہ اس منصب جلیلہ کی تکمیل ہو گئی۔ نبوت کا کردار اپنی اعلیٰ ترین صورت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر آ گیا، لہٰذا اس کے بعد کسی اور اظہار کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

یہاں لطیفہ غور طلب یہ ہے کہ پھر تو اس کردار کی بہت ذرا سی جھلک ہوں گی اور اس کے راستے کو ایک عام آدمی کے لیے اختیار کرنا بہت مشکل، بلکہ ناممکن ہوگا۔ نہیں، ایسا نہیں ہے، بلکہ اس امثال کو سمجھنے کے لیے باری تعالیٰ نے ہی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ بات کہلوائی کہ میں تم ہی جیسا ہوں، یعنی تم میرا راستہ آسانی سے اختیار کر سکتے ہو۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مسلمان کی زندگی میں کردار کا سب سے بڑا آئیڈیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اپنی جگہ بڑی چیز ہے اور اس کے ساتھ ایک اور بڑی چیز اس آئیڈیل کے اتباع کی شدید آرزو ہے۔ یوں ایک عام مسلمان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ دراصل انسانی رشتے کی معراج بن جاتا ہے۔ چناں چہ اس ضمن میں وہ عام آدمی بھی فعال کردار اور حساس رویے کے ساتھ سامنے آتا ہے، جس کے روز مرہ معمولات میں عملِ مذہبی زندگی کا رُجحان کم کم دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں عام آدمی سے لے کر اہلِ نظر اور اہلِ فلسفہ ہی نہیں، بلکہ ملاحتی فرقے اور ترک کی منزل کے صوفیہ تک کے یہاں ذاتِ الٰہیہ کے سلسلے میں تو بے احتیاطی یا بے نیازی دیکھی گئی ہے یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیکھی جا سکتی ہے، لیکن کیا مجال جو آپ کی محض نام کا ایک مسلمان بھی حرمتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں غافل یا بے احتیاط جائے۔ اصل میں یہ معاملہ ہے:

باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

کے طرزِ احساس کا یہ معاملہ عجیب و غریب ہے۔ اور اس کی بنیاد وہی ہے، جس کی طرف سطورِ گذشتہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ چناں چہ اس کی توجیہات کا قصہ بھی عجب اور قدرے طولانی ہے۔ اس حوالت میں ایک طرف عقائد اور شریعت کے تقاضوں کا بیان ہے تو دوسری طرف اہلِ دانش کی نکتہ رس شرح اور اس کے ساتھ ساتھ شیخ و وارفتگی کی وہ تعبیم بھی جو ایک عام آدمی اپنے احساس کی سطح پر کرتا ہے۔ بالا ختصار بس یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر مسلمان کا دل اُس گھر سے شرف کے گھر سے منسوب ہو گیا۔ انسان کے اس دُنیا میں اشرف المخلوقات ہونے کا جواز واضح ہوا اور اُس کے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا مفہوم سمجھ میں آیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا رنگ و بو اور نگار خانۂ فکر و عمل میں انسان ہونے سے مراد کیا ہے اور انسانیت کی قدر و منزلت کیا ہے۔ یوں انسانی زندگی میں خیر کی نعت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مستقل کر دیا گیا۔ اُس کے حال کو مستقبل کی تدریجی وسعتوں تک پھیلا دیا گیا:

آپؐ اُن کے لیے بھی رحمت ہیں
جو زمانے ابھی نہیں آئے
(حنیف اسعدی)

رحمت کی اس نوید سے حیاتِ انسانی کو وہ مفہوم میسر آتا ہے جو اُس کے خلیفۃ فی الارض ہونے کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔ جود و سخا اور عطا و کرم کا یہ معاملہ اہلِ دانش نے اپنے انداز سے سمجھا ہے اور اہلِ فکر و بصیرت نے اپنے طریقے سے۔ اے اپنی سطح اور اک سے ملا نے بھی سمجھا اور بیان کیا ہے اور اہلِ فقہ و شریعت نے بھی۔ حال و قال والے صوفیا نے بھی اس کا فہم اپنے کشف و عرفان سے پایا۔ ہم یہاں اس کی تفصیل میں نہیں جا سکتے، بس اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہمارے شعرا نے اس کا ذکر اپنے اپنے انداز سے کیا ہے اور ہر ایک کا اپنا ایک رنگ ہے۔ یہ رنگ بھی کبھی کبھی ایک ہی شاعر کے یہاں مختلف صورتوں میں ملتا ہے۔ کبھی کبھی ایک ہی شعر میں ایک سے زیادہ رنگ جھلکتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ہمارے شعرا نے اس معاملے کو اپنے اپنے طور پر برتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں ایک بھی عشق کے مضمون کو سونگھ سے بڑھ کر کوئی معاملہ نہیں ہے۔ یہ گہرا اور راسخ عقیدہ بھی ہے، شوق بھی اور عشق بھی۔ کمال معرفت یہاں تک لانے کی آرزو رکھتے ہیں کہ ہم کی زندگی کا مقصد ہی اس کے نبی کی معرفت ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں سیرت و کردار کا بیان نعت بن گیا ہے تو کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے بیان نے نعت کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ ہم کہیں کسی آیتِ قرآنی اور حدیث کے ٹکڑے سے نعت کا مضمون وضع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی حقائق اور اجتماعی تہذیبی احساس کے رنگوں سے بھی نعت کا پیکر آراستہ کیا گیا ہے۔ اس سے نعت کی معنوی وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ اس باب میں جذبہ اظہار کی فراوانی کا بھی پتا چلتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

اُس کا پیام اُنس و مواخات، روح دیں
اس کا نظام عدل و مساوات، جانِ خیر
(حفیظ تائب)

اُسی کا عکس ہیں سارے جہاں کی تہذیبیں
کہاں نہیں ہے ضیائے محمد عربی
(صبا اکبر آبادی)

جاں تری سربسر جمال، دیں ترا آئینہ مثال
تجھ کو ترے عدو نے بھی دیکھا تو ہو گیا ترا
(احمد ندیم قاسمی)

زندگی کو سحر کرنے والے
ہر سحر میں کئی سورج ہیں ضیا میرے
عدالت، امانت، دیانت میں یکتا
حیات، آشتی، راحتی نام تیرا
(ضمیر جعفری)

شوکتِ شاہانِ عالم اُس فقیری پر نثار
جس فقیری کو نبی کا آستاں بخشا گیا
(اقبال عظیم)

انسانیت کو اوج شرف ہے تمھاری راہ
رحمت تمھارا ذکر، عبادت تمھارا نام
(سجاد باقر رضوی)

وہ جو تیروں سے معرّا کیا راز تھا، طے ہوا کس طرح وحدت کا فاصلہ
ترے اقبال کی کیا خبر ہوا سے، جو حرا میں محبت کی امرا نہیں
(عرش صدیقی)

لمحے لمحے کی مٹھی میں بھینچو ترے
ہر زمانے کی مشعل زمانہ ترا
(مظفر وارثی)

بس ایک آپ کا دربار ہے پناہ جہاں
بس ایک آپ کا دربار خاص و عام کا ہے
(حافظ لدھیانوی)

تو سطوتِ شاہاں کے لیے مخزنِ مکافات
تو مونس و ہم درد ہر اک چاکِ حزیں کا
(نصیر کاشمیری)

سب جہانوں میں اُسی نام کا جلتا ہے چراغ
سب جہانوں کا نبی ہادی و رہبر نکلوں
(کلیم عاجز)

میں جتنا بھی لکھتا ہوں شانِ نبیؐ میں
یہ محسوس ہوتا ہے کم لکھ رہا ہوں
(افتخار رحمانی)

سموئے خود میں گر اُس خلقِ کامل کے اُجالوں کو
تو دامانِ حرمؐ دامن زرِ بفت ہو جائے
(اسلم انصاری)

(ختم شد)



مبین مرزا

اُردو نعت کی شعری روایت

(گذشتہ سے پیوستہ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ایک مسلمان کے لیے ہر عمل اور ہر نکتۂ فکر کا بنیادی حوالہ اور معنویت کا وہ سرچشمہ ہے کہ نکتہ وری کے سارے سوتے یہیں سے نکلتے ہیں یا پھر یہیں آ کے ملتے ہیں۔ چناں چہ نعت کے مضامین میں زباں کا حوالہ ہو یا بیاں کا، ہر حرکت تأخیر کا ساکن ہو یا ساکن وثبات کا، یا پھر وصل و فصل کا سوال — ہر مضمون کی گہرائی اور ہر خیال کی وسعت دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شاعر کے جذباتی لگاؤ کی گہرائی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ مطالعاتِ نعت میں یہ نکتہ کھلتا ہے کہ یہاں فلسفے میں ڈھکی چھپی جاتی ہے اور دل کی ڈھڑکن میں دقیق فلسفہ گونج اٹھتا ہے۔ اس لیے کہ یہ محل ہی ہوتا ہے کہ جہاں دل و نظر کی نہیں علم و فلسفے کی بھی کایا پلٹ جاتی ہے۔ یہاں سکوت کلام سے بڑھ جاتا ہے اور افزوں ہو جائے تو کلام مفرد ہو جاتا ہے:

ہر ایک سمت سے آتی ہے تیری ہی خوش بو
ہر اک زمانہ ، زمانہ ترے جمال کا ہے
(شہزاد احمد)

دربار و محافل کو بھی ہو تجھ پہ سدا رشک
اے غار حرا کیا تجھے تنہائی ملی ہے
(سحر انصاری)

بابِ حرم پہ ہے کہیں لمس مرے بھی ہاتھ کا
فرشِ حرم پہ ہے کہیں میری جبیں کا بھی نشاں
(یاسمین حمید)

سفر میں وقت کی رفتار رہ گئی پیچھے
ورائے عقل و گماں ہیں مسافتیں تیری
(انور جمال)

عزم سفر جو طیبہ کا ہو، نکلیں وقت سے ہم آگے
دل آنکھوں سے آگے، آنکھیں دل سے ایک قدم آگے
(حسن اکبر کمال)

اس میں کلام نہیں کہ عالمی ادب نے مذہبی فکر کے جو نقوش ابھارے ہیں ان میں مذہبی تعلیمات سے اور اُن تعلیمات کے حامل پیغام بروں سے عقیدت کے جذبات کا اظہار بھی نمایاں طور سے ہوا ہے خاص طور سے اُن طرف کی تہذیبوں اور زمانوں میں یہودیت، عیسائیت، ہندومت اور سکھ مذہب کے ماننے والوں کے یہاں اس احساس کو صاف طور سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ہر مذہبی فکر کے تخلیق کاروں نے یہ کام اپنی استعداد اور جذبے کی فراوانی کے مطابق کیا ہے لیکن تمام تر معروضیت کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کی فوقیت اور کیفیت ہی مختلف نظر آتی ہے جسے ہم اردو شعر و سخن میں عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں ابھرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ اُسی صداقت کا ثمر ہے جس کی بابت ہم اس سے قبل ورلعنا لک ذکرک کے ذیل میں گفتگو کرآئے ہیں۔ اس ضمن میں یہ قابل لحاظ بات اپنی جگہ کہ جس کثرت سے ہماری شاعری نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے دنیا کی کسی دوسری زبان کی شاعری میں ایسا اور اتنا ذکر کسی دوسری شخصیت کا کہیں نہیں ہوا۔ بایں ہمہ اہم بات یہ بھی ہے کہ یہ ذکر جس والہانہ پن، وارفتگی اور شوق کے ساتھ ہوا ہے اُس کی کوئی مثال دنیا کے شعر و سخن میں نہیں ملتی۔ اس ضمن میں یہ نکتہ بھی بہت اہم ہے کہ اس وارفتگی اور شوق میں وابستگی کے قرینے اور معنی آفرینی کے پہلو تحقیق کار کی نظر سے ہرگز اوجھل نہیں ہوتے۔ ذرا یہ اشعار دیکھیے:

کوئی بھی جستجو ہو کوئی لگن
ذوقِ منزل وہیں سے ملتا ہے
(عشرت رومانی)

یہ اور راستے ہیں ہدیٰ خواں سنبھل کے چل
طیبہ کا ذرّہ ذرّہ تجھے دل دکھائی دے
(ادا جعفری)

کہاں ہو گرد نہ ہو اس جا ہجومِ آرزو مہداں
ہے اُس کا آستانہ قبلہ سارے آستانوں کا
(عبدالعزیز خالد)

نگاہ دیکھ کہ ہے ذرّہ ذرّہ دیارِ جمال
ہے ذرّہ ذرّہ یہاں آفتاب ، کیا دیکھوں
(عاصی کرنالی)

کاش یہ میری جبیں اور نقشِ پائے مصطفیٰ
صرف روزِ حشر تک ہو جائیں ساکن ساتھ ساتھ
(واجد خلیل)

تو سائبان کی صورت محیطِ عالم پر
کرن کرن ترے سائے طناب کھلے
(محسن احسان)

یہ کس کی سمت پے یہ پے رواں دواں ہیں ساعتیں
یہ کس کے پائے بوس کا ہے اشتیاق دیکھنا
(جعفر بلوچ)

نظر میں رکھتا ہوں یوں بھی تری مثالوں کو
ترا ہی عکس سمجھتا ہوں میں اجالوں کو
(عزیز احسن)

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار میں والہانہ پن، وارفتگی، دل بستگی، وابستگی اور شوق کے ساتھ ایک قرینہ اس دولت بیدار پر ناز آفرینی کا بھی ہے۔ نسبت کا اعزاز اہلِ دل اور اہلِ صفا کے لیے کیسی ناز پرور شے رہی ہے، اس کا اندازہ صحیح معنوں میں اُسی وقت ہو سکتا ہے جب اس اظہار کے مختلف شیڈز نظر میں ہوں۔ اس لیے کہ یہ معاملہ کیا تجھ کو خبر کون کہاں جھوم رہا ہے والا ہے۔ اس بزمِ فخر و انبساط میں ہر تازہ پرور کی اپنی ایک کیفیت ہے اور اس کے بیان کا گماں تھے ایسے کہ آثار تک نہیں کے نہ تھے
حضور آپ نہ ہوتے تو ہم کہیں کے نہ تھے
(حنیف اسعدی)

تری عقدہ کشائی سے کھلے عقدے سبھی دل کے
ہوئیں سب مشکلیں آساں تری مشکل کشائی سے
(جمال پانی پتی)

اُس پیکرِ جمال کی پرچھائیں بھی جمال
اُس روشنی کے پیڑ کا سایہ بھی روشنی
(بیدل حیدری)

طلوعِ اسمِ محمد فقط نظارہ نہیں
ہماری صبح شرف کا کوئی کنارہ نہیں
(منظور حسین یاد)

درود اُن پہ پڑھا اور سعادتیں پائیں
بنا گیا مرے سینے سے سب غبار درود
(خاطر غزنوی)

لیکن تو جذبِ تختہ یہ ہے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جھڑکتے دلوں کا یہ آہنگ اب بھی جب کسی گہرے باطنی تجربے کی صورت میں ابھرتا ہے تو ایک الگ طرح کی اُمنگ اور ایک نوعی ترنگ کو جگاتا چلا جاتا ہے۔ چند قادری محسوس کرتا ہے کہ بات سامنے کی ہے اور سنی ہوئی بھی ہے لیکن ہر نئے اظہار میں شاعر کی وارفتگی نے اسے پہلے انفرادی کیفیت کے طور پر نکھارا اور پھر تہذیب کے اجتماعی باطنی اعتبار کے اظہاریے میں منعکس کر کے پیش کر دیا۔ نعت کا یہ قرینہ اپنی ہی ایک دل کشی اور اپنی ایک اثر رکھتا ہے۔ ذرا دیکھیے:

نخلِ صحرا کی طرح خشک ہوں ، وہ ابرِ کرم
مجھ پہ برسے تو مجھے برگ و ثمر مل جائے
(سلیم احمد)

نئے لہجے میں یہ صد عجز و خدامت لکھوں
صرف الفاظوں کی زباں میں تری مدحت لکھوں
(مرشار صدیقی)

کام بھی کوئی اُس طرح کا تھا
شان اُن کی سوچیے اور سوچ میں کھو جایئے
نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جایئے
(خورشید رضوی)

کتنی صبحیں ظہور کرتا ہے
جاگتا رات بھر مدینے میں
(صفا لاہوتی قاسمی)

حضوری کی تمنا، حاضری کی خواہش، اپنی فروتریت، پستی اور ندامت کا احساس، خود احتسابی کا دیدنی پہلو، رحمت گویا نعت میں شفاعت کی آرزو کے مضامین نعت کی روایت میں آغاز ہی سے ملتے ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اوّلین نظر نے احساس کے ان محرکوں کو اپنے قریبی عربی عقیدی شاعری کی خصوصیت میں بھی دیکھا ہے۔ اردو نعت میں کیفیت دل کے یہ پہلو بدرجۂ اوّل سے چلے آتے ہیں اور اب تک کسی نہ کسی صورت مضامینِ نعت میں انھیں کی راہ پاتے رہتے ہیں —

ہم تو لے لیا گھر کا
(اختر انجم)

اسی دہلیز پہ بیٹھا رہے میرا جھکایا
انھیں کوچوں میں گھومے میرے بچوں کی جوانی
(محمد انصار اختر)

جو مدینے کے سفر میں کھو گیا
اس مسافر کا پتا ہی اور ہے
(شاہد حسن)

حضور آپ جو سن لیں تو بات بن جائے
حضور آپ جو کہہ دیں تو کام ہو جائے
(مسیح انجم)

ایک مقام پر عرض کیا تھا کہ نعت کا مطالعہ کسی بھی موضوع پیش نظر کر کے یا کسی بھی عنوان کے تحت کیا جائے، اس حیثیت کے ساتھ ایک مضمون میں تو کیا پوری کتاب کی ضخامت میں بھی سمیٹ لینا آسان نہیں۔ کم سے کم راقم الحروف تو تجربے کی صداقتوں کے ساتھ اس احساس سے دوچار ہے۔ خیر، سچ پوچھیے تو یہ ہم اس مضمون کے آغاز میں بھی دل نہیں تھا کہ مدحتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی نکتے کو اس تحریر میں بہ تمام و کمال پیش کر دیا جائے گا۔ محض ایک بات ذہن میں تھی کہ ہماری اردو شعری تہذیب سے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبے سے فیض پایا اور جو ثمر قبول کیا ہے اسے سامنے لانے میں جس طرح ممکن ہو بیان کیا جائے — حقیقت یہ ہے کہ اس مرحلے پر آ کر بیان کرنے کی بات بھی مرہم بجنی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ کام اپنے برتے پر جاری کیوں کر ہو سکتا ہے۔ یہ تو اصل میں توفیقِ ایزدی کا معاملہ ہے کہ ایک خیال ایک بات دل میں آئی اور پھر اپنے تئیں اس کو سمجھنے اور قابلِ فہم بنانے کی کوشش نے اس مضمون کی صورت اختیار کر لی۔ یہ باب کرم ہے سو اس کی جانب نگاہ کا اٹھ جانا ہی فیض یابی کا آغاز ثابت ہوتا ہے۔ یہ مضمون اسی حقیقت کا ثبوت ہے۔

اس سفر کا اظہار بھی چند در چند وجوہ کی بنا پر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس مضمون میں جن نکات اور مباحث پر توجہ دی گئی وہ اپنی بہتر تفہیم کے لیے اس سے کہیں زیادہ شرح و بسط کے ساتھ مطالعے کے متقاضی ہیں۔ یہاں تو صرف اشارات سے کام لیا گیا ہے۔ اسی طرح جن شعرا کے اشعار حوالے کے طور پر درج کیے گئے ان کے علاوہ بھی کتنے ہی اہم ہم ایسے ہو سکتے ہیں جو یہاں درج ہونے سے رہ گئے ہوں گے لیکن جن کے یہاں نعت کی روشنی اُن کے ذاتی سرمایۂ تخلیق ہی کو منور نہ کرتی ہوگی، بلکہ ہمارے شعر و ادب کی روایت میں بھی دور تک اُجالے بکھیرتی ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ کائنات کی وسعتوں کو ایک گفتگو میں سمیٹنا اتنا دشوار نہیں، جتنا نعت کے موضوع اُس کی لطافت، نکتہ آفرینی، اُس کے جمالیاتی پیرائے، مدارجِ ادب اظہار، جذبہ و فکر کے امتزاج، بیان کی تہ داری، لہجے، قرینے، وسعت اور معنویت کے رنگوں کو یہ یک وقت ابلاغ کے دائرے میں لانا۔ یہی سبب ہے کہ اس موضوع کے نکتہ ور اور ظلِ کمال بار بار اپنی ہمّتِ اور عجز کے احساس سے دوچار ہوتے ہیں۔ راقم الحروف کو اپنے محدود بضاعت کا بہ خوبی اندازہ ہے۔ تاہم سعیِ مشکور تو بڑی چیز ہے اس باب میں اظہار کی ادنیٰ سی کاوش بھی لائقِ افتخار اعتراف سے کم نہیں۔

آخر میں بس یہ عرض کرنا ہے کہ اردو زبان و ادب کی تہذیب کا سب سے بلیغ، موثر اور رفیع سطح پر اظہار غزل کے اسلوب میں ہوا ہے۔ عشق و وارفتگی، جذب و شوق، سرشاری، بھیجی کی نسبت، افتخار، انبساط، خلوتِ جاں عرضِ حال — غزل کے جتنے قرینے ہیں انھیں مجازی سطح سے اٹھا کر حقیقت کے درجے میں دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ غزل اور نعت میں عجب امتزاج اور ارتباط پایا جاتا ہے۔ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہماری تہذیب کے اس کنائے (غزل) پر اس قدر ٹوٹ پڑنی ہے کہ احساس کے منطقے اور اظہار کے خطے تک سمٹتے اور جگمگاتے محسوس ہوتے ہیں۔ غزل نے مجرّد (کے باب میں جذباتی کیفیات) کا اور نعت نے حقیقت (کے باب میں روحانی احساسات) کا جس طرح احاطہ کیا ہے دونوں کی اپنی اپنی کام یابی کا ثبوت تو ہے ہی لیکن ہماری اس تہذیب کا انحصار بھی یہی ہے کہ جو اپنے فروغ کی زندگی میں گھر کر احساس کے دونوں رُخ منور رکھتی ہے۔ غزل نے ہمارے دل کی دھڑکنوں کو نعت نے ہماری روح کے ہم آغوش نغمے سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اس لیے کہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے دل کی آواز اور ہماری روح کی پکار ہے۔ اسی صدا کا اُجالا ہماری تہذیب زبان و ادب میں ہر فکر و عمل کے سامنے گوشۂ خضر کا ہے ●

آپ کی جمیلہ

وہ دونوں کلاس فیلو تھے' لڑکی پوری یونیورسٹی میں خوبصورت تھی اور لڑکا تمام لڑکوں میں وجیہہ' دونوں ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے اور آخر میں دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے' معاملہ رومیو جولیٹ جیسا تھا' دونوں کے خاندان ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے' شادی مشکل تھی' دونوں باعزت گھرانوں کے سعادت مند بچے تھے' یہ بھاگ کر شادی کیلئے تیار نہیں تھے اور خاندان اپنے اپنے شملے نیچے نہیں لا رہے تھے لہٰذا معاملہ پھنس گیا' لڑکے اور لڑکی نے پوری زندگی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا' یہ دونوں اپنے اپنے گھر میں رہتے رہے' پانچ سال دونوں کے درمیان کوئی رابطہ نہ ہوا' والدین شادی کی کوشش کرتے مگر یہ انکار کرتے رہے یہاں تک کہ لڑکی کے والدین ہار مان گئے' لڑکی نے لڑکے کو فون کیا' لڑکے نے فون اٹھایا' لڑکی کی صرف ہیلو سنی اور کہا'' مجھے بتاؤ' میں نے بارات لے کر کب آنا ہے'' دونوں کے والدین ملے' شادی ہوئی اور دونوں نے اپنا گھر آباد کر لیا' لڑکے نے کاروبار شروع کیا' اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور وہ خوش حال ہو گئے' یہ شادی بیس سال چلی' اس دوران تین بچے ہو گئے' خاتون کو اپنے حسن' اپنی خوبصورتی پر بہت ناز تھا' وہ تھی بھی ناز کے قابل' وہ 45 سال اور تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود جوان لگتی تھی' خاوند بھی روز اول کی طرح اس پر فریفتہ تھا' وہ روز جی بھر کر بیوی کی تعریف کرتا تھا لیکن پھر ایک دن وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا' خاتون کی گردن پر چھوٹی سی گلٹی نکلی اور یہ گلٹی پھیلتے پھیلتے ناسور بن گئی' ڈاکٹروں کو دکھایا' ٹیسٹ ہوئے' پتہ چلا خاتون جلد کے کینسر میں مبتلا ہیں' خاوند صرف خاوند نہیں تھا وہ اپنی بیوی کا مہینوال تھا' وہ اپنی ران چیر کر بیوی کو کباب بنا کر کھلا سکتا تھا' وہ بیوی کو لے کر دنیا جہاں کے ڈاکٹروں کے پاس گیا' ایک کلینک سے دوسرے کلینک' ایک ڈاکٹر سے دوسرے ڈاکٹر اور ایک ملک سے دوسرے ملک' وہ دونوں چلتے رہے یہاں تک کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا' خاتون کا جسم گلٹیوں سے بھر گیا' یہ مصیبت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک دن دوسری آفت آن پڑی' خاوند کی گاڑی ٹرک سے ٹکرائی اور وہ شدید زخمی ہو گیا' وہ ہسپتال پہنچا' پتہ چلا وہ بینائی کی نعمت سے محروم ہو چکا ہے' آپ اس کے بعد الیہ ملاحظہ کیجئے' شہر کا خوبصورت ترین جوڑا' بدقسمتی' بیوی جلد کے کینسر کی مریض اور خاوند آنکھوں سے اندھا' لوگ انہیں دیکھتے تھے تو کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے لیکن یہ دونوں اس کے باوجود مطمئن تھے' یہ روز صبح باغ میں واک بھی کرتے تھے' سینما بھی جاتے تھے اور ریستورانوں میں کھانا بھی کھاتے تھے' بیوی خاوند کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ ساتھ چلتی تھی' وہ اسے گائیڈ کرتی تھی اور خاوند بیوی کی گائیڈ پنس پر چلتا جاتا تھا' یہ سلسلہ بھی کئی ماہ تک چلتا رہا لیکن پھر بیوی نے خاوند سے ایک



عجیب مطالبہ کر دیا' وہ اکیلی سوئٹزرلینڈ جانا چاہتی تھی' خاوند نے وجہ پوچھی' بیوی کا کہنا تھا وہ دس پندرہ دن اکیلی رہنا چاہتی ہے' خاوند نے اس کے ساتھ جانے کی ضد کی لیکن وہ نہ مانی' اصرار اور انکار بڑھتا رہا یہاں تک کہ آخر میں وہی ہوا جو ایسے معاملات میں ہوتا ہے' خاوند نے بیوی کو اجازت دے دی۔

بیوی سوئٹزرلینڈ چلی گئی' خاوند نے وہ دس دن بڑی مشکل سے گزارے' وہ شادی کے 20 برسوں میں ایک دن کیلئے بھی اکیلے نہیں ہوئے تھے' یہ ان کی جدائی کے پہلے دس دن تھے' یہ دس دن پہاڑ تھے' خاوند اس پہاڑ تلے سسکتا رہا' دس دن بعد بیوی نے آنا تھا' خاوند ائیر پورٹ پہنچا لیکن بیوی نہ آئی' خاوند کو دنیا ڈولتی ہوئی محسوس ہوئی' وہ سارا دن بیوی کو فون کرتا رہا' بیوی سے رابطہ نہ ہوا لیکن شام کو بیوی کا خط آ گیا' وہ خط ان کے بیٹے نے پڑھا' وہ خط صرف خط نہیں تھا' وہ ایک تحریری قیامت تھی اور پورا خاندان اس تحریری قیامت کا شکار ہوتا چلا گیا' میں اس قیامت کی طرف آنے سے قبل آپ کو دنیا کی ایک خوفناک لیکن دلچسپ حقیقت بتاتا چلوں۔

دنیا میں ایسے بے شمار سینٹرز ہیں جہاں آپ اپنی مرضی سے مر سکتے ہیں' یہ سینٹرز لاعلاج مریضوں کیلئے بنائے گئے ہیں' دنیا میں یہ لوگ جب امراض کا بوجھ اٹھا اٹھا کر تھک جاتے ہیں اور یہ چین کی موت مرنا چاہتے ہیں تو یہ لوگ ان سینٹرز میں جاتے ہیں' اپنی میڈیکل رپورٹس دکھاتے ہیں' ڈاکٹرز ان کی حالت اور رپورٹ چیک کرتے ہیں' ان سے یہ حلف نامہ لیتے ہیں'' ہم اپنی مرضی سے دنیا چھوڑ کر جا رہے ہیں'' ان کی مرضی سے ان کی موت کا دن اور وقت طے کرتے ہیں' ان کی آخری خواہش پوری کرتے ہیں اور پھر انہیں زہر کا ٹیکہ لگا کر دنیا سے رخصت کر دیتے ہیں' یہ عمل طبی زبان میں یوتھانیزیا (euthanasia) یعنی آسان موت کہلاتا ہے' یہ دنیا کے 7 ممالک میں قانونی ہے اور اتنے ہی ملکوں میں اس کی اجازت کیلئے بحث چل رہی ہے' سوئٹزرلینڈ بھی دنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جہاں یوتھانیزیا کو قانونی سٹیٹس حاصل ہے' زیورخ شہر میں یوتھانیزیا کا سینٹر بنا ہے' یہ سینٹر انتہائی خوبصورت جگہ پر قائم ہے' سینٹر کے کمرے پہاڑوں' آب شاروں اور جھیلوں کے کنارے بنائے گئے ہیں' مریض بیڈ پر لیٹ کر زندگی کی آخری صبحیں اور شامیں دیکھتے ہیں اور آخر میں مہربان ڈاکٹروں اور نرسوں کے ہاتھوں میں زندگی کی سرحد پار کر جاتے ہیں' وہ خاتون بھی یوتھانیزیا کیلئے سوئٹزرلینڈ گئی تھی' وہ کینسر کا دکھ برداشت نہیں کر پا رہی تھی چنانچہ اس نے آسان موت لینے کا فیصلہ کر لیا' وہ زیورخ گئی' زندگی کے آخری دس دن گزارے اور عین اس وقت اپنے لئے موت کا تعین کر لیا جب اس کی فلائیٹ نے وطن کی مٹی کو چھونا تھا' ادھر فلائیٹ اتری اور ادھر وہ زندگی کی سرحد پار کر گئی' خاتون کا آخری خط بیٹے کے ہاتھ میں تھا' وہ سسکیاں لے لے کر خط پڑھ رہا تھا اور خاوند سر جھکا کر اپنی بیگم کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔

بیوی نے اپنی پوری زندگی کا احاطہ کیا' اس نے بتایا' وہ جب پہلی بار یونیورسٹی میں ملے تھے تو اس نے کیا محسوس کیا تھا' وہ یونیورسٹی میں لڑتی کیوں تھی اور وہ کون سا دن تھا جب لڑتے لڑتے اسے اس سے محبت ہو گئی تھی' اس نے فراق کے وہ پانچ سال کیسے گزارے تھے اور اس نے شادی کے بعد اپنے بچوں کو ملازموں کے رحم وکرم پر کیوں چھوڑے رکھا تھا'' میں اپنی محبت کو تقسیم نہیں کر سکتی تھی' میں تمہارا حصہ اپنے بچوں کو بھی نہیں دے سکتی تھی'' اس نے 20 سال کی ازدواجی زندگی کس مسرت اور سرشاری میں گزاری اور پھر جب اسے پہلی گلٹی نکلی تو اس نے کیا محسوس کیا' وہ خود کو روز بروز بدصورت ہوتا ہوا دیکھتی تھی تو اس کے دل پر کیا گزرتی تھی' وہ قدرت کا یہ فیصلہ بھی سہتی چلی گئی لیکن پھر عجیب واقعہ ہوا'' آپ نے پہلے بچے بورڈنگ سکول میں بھیج دیئے' میں جانتی تھی آپ نے یہ فیصلہ کیوں کیا' آپ نہیں چاہتے تھے میرے بچے مجھے اس حالت میں دیکھیں اور پھر میں ان کی آنکھوں میں اپنے لئے ترس دیکھوں' پھر آپ ملازموں کو رشوت دیتے تھے اور وہ روزانہ کوئی نہ کوئی شیشہ توڑ دیتے تھے' میں آپ سے شیشے لگوانے کا کہتی تھی' آپ ہنس کر ٹال جاتے تھے یوں آہستہ آہستہ گھر سے سارے آئینے غائب ہو گئے' آپ نہیں چاہتے تھے میں اپنی آنکھوں سے اپنی بدصورتی دیکھوں' بات اگر یہاں تک رہتی تو بھی میں برداشت کر جاتی لیکن آپ نے آخر میں عجیب کام کیا' آپ نے ایکسیڈنٹ کیا اور خود کو اندھا ڈکلیئر کر دیا' میں جانتی ہوں آپ کی آنکھیں ٹھیک ہیں' آپ مسلسل چھ ماہ سے اندھے پن کی ایکٹنگ کر رہے ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ نہیں چاہتے تھے میرے دل میں ایک لمحے کیلئے بھی یہ خیال آئے میں آپ کو بدصورت دکھائی دے رہی ہوں یا میں آپ کی آنکھوں میں اپنی بدصورتی کو پڑھ لوں چنانچہ آپ اندھے بن گئے' آپ کا یہ مصنوعی اندھا پن محبت کی انتہا تھی' میں یہ انتہا برداشت نہ کر سکی چنانچہ میں نے دنیا سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا' میں دنیا سے جا رہی ہوں' آپ اب پلیز اندھے پن کی یہ ایکٹنگ بند کر دیں' یہ خط پکڑیں اور خود پڑھنا شروع کر دیں'' یہاں پہنچ کر بیٹے کے منہ سے چیخ نکل گئی' باپ نے اس کے ہاتھ سے خط لیا اور اونچی آواز میں پڑھنا شروع کر دیا'' آپ پلیز میرے بعد اپنا خیال رکھئے گا' سارے تولئے الماری میں رکھے ہیں' میں درزی کو پانچ سال کے کپڑے دے آئی ہوں' وہ سال میں دس جوڑے سی کر دے جائے گا' آپ نے وہ سارے کپڑے پھٹنے گھسنے تک پہننے ہیں' دانت چیک کراتے رہا کریں اور صبح کی سیر کبھی نہیں بھولنی اور آخری بات چڑیوں کو روز دانا ڈالنا ہے اور میری بلیوں کا ہمیشہ خیال رکھنا ہے' اللہ حافظ۔ آپ کی جمیلہ''۔

خاوند نے خط تہہ کر کے جیب میں رکھا اور چڑیوں کے دانے کا ڈبہ تلاش کرنے لگا۔

لفظ اضافی ہوتے ہیں

نیویارک کے ایک اطالوی ریستوران میں نوجوان لڑکی نے نوجوان لڑکے کی آنکھوں میں جھانکا اور آہستہ سے سرگوشی کی ''محبت گفتگو ہے'' اس کے لہجے میں یقین کی کھنک تھی' نوجوان لڑکے کی آنکھوں کی پتلیوں اور پپوٹوں کے درمیان سرخ ڈورے سے بنے اور یہ ڈورے آہستہ آہستہ پھیلتے چلے گئے۔

قدرت نے انسان کے آئی کانٹیکٹ میں عجیب جادو رکھا ہے' دنیا میں جب بھی کوئی شخص پیار سے' محبت سے یا عقیدت سے دوسرے کی آنکھ میں جھانکتا ہے تو آنکھوں کی روشنی میں' جذبوں کے سرخ ڈوروں میں اور دل کی بے لگام' بے ربط دھڑکنوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ انسان قدرت کا سب سے بڑا اداکار ہے' یہ جھوٹ بولنے یا چھپانے پر آ جائے تو یہ اپنے آپ سے بھی چھپ جاتا ہے' یہ خود سے جھوٹ بول لیتا ہے' یہ اتنا بڑا اداکار ہے یہ دل کی بات بھی اپنے دماغ تک نہیں پہنچنے دیتا' یہ اپنا منصوبہ اپنے دل پر بھی آشکار نہیں ہونے دیتا لیکن یہ اتنا بڑا اداکار ہونے کے باوجود اپنی آنکھوں سے نہیں چھپ سکتا' انسان کی آنکھیں جسم کا واحد عضو ہیں جو چھپا نہیں سکتیں' جو جھوٹ نہیں بول سکتیں' انسان کیا سوچ رہا ہے؟ یہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کی آنکھ میں آ جاتا ہے اور یہی وجہ ہے دنیا کے تمام جانور انسان کو اس کی آنکھ سے سمجھتے ہیں۔ انسان کے سامنے شیر کھڑا ہو یا چیتا تمام جانور اور پرندے انسان کی آنکھ میں جھانکتے ہیں اور فوراً اس کی ذات میں چھپی حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں۔ انسان جس قدر شیطان' بدفطرت اور مکار ہوتا جاتا ہے جانور اور پرندے اس سے اسی قدر دور ہٹتے جاتے ہیں جبکہ یہ بغیر ڈرے' بغیر جھجکے نیک لوگوں کی پلیٹ سے بوٹی تک اٹھا لیتے ہیں' یہ ان کے کندھوں پر بیٹھ کر دانا چگتے ہیں اور انہیں ذرا بھر خوف محسوس نہیں ہوتا' کیوں؟ کیونکہ یہ برے انسان اور اچھے انسان کو اس کی آنکھوں سے پڑھ لیتے ہیں چنانچہ اگر اچھے انسان نے ہاتھ میں تلوار بھی اٹھا رکھی ہو تو جانور اور پرندے اس سے خوفزدہ نہیں ہوتے اور برے انسان کے چہرے پر سمندر جتنی وسیع مسکراہٹ بھی ہو تو بھی پرندے اور جانور اس سے محفوظ فاصلے پر رہتے ہیں۔ انسان کی آنکھ میں اتنی جامع کمیونیکیشن پاور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر انسان کو زبان نہ دی ہوتی تو بھی یہ صرف آنکھ سے اپنے تمام جذبے' اپنے سارے احساسات اور اپنی ساری ضرورتیں دوسروں تک ''کمیونی کیٹ'' کر لیتا۔ انسان دنیا کی ہر چیز سے چھپ سکتا ہے لیکن اپنی آنکھ میں الف ننگا ہوتا ہے۔

میں واپس نیویارک کے اطالوی ریستوران کی طرف آتا ہوں۔ لڑکی' لڑکی تھی چنانچہ وہ دنیا کی تمام لڑکیوں کی طرح گفتگو کو محبت سمجھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا محبت اظہار کا نام ہے محبت لفظوں' فقروں اور گھنٹوں تک پھیلی گفتگو کا نام ہے' لڑکی درست سوچ رہی تھی دنیا کی ہر عورت گفتگو کو محبت سمجھتی ہے' عورت سمجھتی ہے جب تک مرد کی محبت قائم رہتی ہے اس وقت تک اس کی زبان حرکت میں رہتی ہے' وہ لفظوں اور فقروں کے ذریعے اپنی محبت' اپنی چاہت کا اظہار کرتا ہے اور جس دن مرد کی زبان کو بریک لگ جاتی ہے اس دن محبت کا رنگ اڑ جاتا ہے' اس دن قربت کافی کا خالی کپ' سگریٹ کی خالی ڈبی اور خوشبو کی خالی بوتل بن جاتی ہے۔ اس دن انسان' لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں لیکن جس طرح خوشبو کے بغیر بوتل' سگریٹ کے بغیر ڈبی اور کافی کے بغیر کپ کچھ نہیں ہوتا بالکل اسی طرح قربت بھی محبت کے بغیر خالی خالی' بے رنگ بے رنگ سی ہو جاتی ہے۔ دنیا کی تمام عورتوں کا خیال ہے جس دن مرد ان کی موجودگی میں بور ہونے لگے' یہ گفتگو کی بجائے کتابوں' ٹیلی ویژن سکرین اور کھڑکی کے شیشے پر جمے موسموں میں دلچسپی لینے لگے اس دن اس کی محبت کی کافی کا کپ خالی ہو جاتا ہے اور جس دن عورت ماں جیسی حرکتیں کرنے لگے' اسے مرد کی جگہ چھتری' ٹفن' لحاف' آٹے کے کنستر اور تار پر لٹکے کپڑوں کی زیادہ فکر ہونے لگے اور وہ شام کی چائے کے دوران کریلوں کا نرخ ڈسکس کرنے لگے یا اسے سیمنٹ کی مہنگائی کی ٹینشن ہونے لگے اس دن عورت کا کپ' عورت کی بوتل بھی خالی ہو جاتی ہے۔ یہ نوجوان لڑکی بھی گفتگو کو محبت سمجھتی تھی چنانچہ یہ پچھلے دو گھنٹوں سے مسلسل باتیں کر رہی تھی اور نوجوان لڑکا اس کی باتوں کی رو میں لڑھکتا' بہتا چلا جا رہا تھا۔ گرم ہاتوں اور اسلتے فقروں کے دوران کھانا کب ٹھنڈا ہوا اور ٹھنڈے سافٹ ڈرنک کب گرم ہوئے دونوں کو کچھ خبر نہیں تھی جبکہ ان سے میز بھر کے فاصلے پر ایک ادھیڑ عمر جوڑا بیٹھا تھا' یہ دونوں حضرت نوحؑ کے دور کے انسان لگتے تھے' بوڑھی اماں کی گردن سے جھریوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں اور کانوں کی لوؤں پر مردوں کی مونچھوں کے برابر بال تھے اور اس کا سر طوفان میں پھنسی چڑیا کی طرح جھر جھری لے رہا تھا اور بابا جی اس قدر بوڑھے تھے کہ گمان ہوتا تھا ان کی عمر کے تمام دریا نہ صرف سوکھ چکے ہیں بلکہ ان کی جگہ شہر آباد ہو چکے ہیں۔ لڑکی نے جب پہلی بار بابا جی کے چہرے کو دیکھا تو اس نے نوجوان کا ہاتھ دبا کر سرگوشی کی ''یہ بابا اتنا بوڑھا ہے کہ یہ خود اپنا باپ لگتا ہے'' نوجوان نے یہ سن کر اتنا زوردار قہقہہ لگایا کہ اس کے حلق میں موجود لائم سوڈا اس کے نتھنوں سے باہر ابل گیا۔ یہ ادھیڑ عمر جوڑا نوجوان جوڑے کے بالکل برعکس تھا' یہ بھی دو گھنٹے سے ریستوران میں بیٹھا تھا لیکن اس کی میز کی پلیٹوں' چمچوں اور کانٹوں تک نے ان کی آواز نہیں سنی تھی' یہ دونوں خاموشی سے آئے' میز پر بیٹھے' اشارے سے مینیو کارڈ مانگا' آرڈر دیا' ان کا کھانا آیا اور یہ دونوں چپ چاپ کھانے لگے' دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھ میں جھانکنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ لڑکی کو یہ جوڑا برا لگ رہا تھا چنانچہ اس نے لڑکے کے کان میں سرگوشی کی' ان دونوں کی محبت مر چکی ہے' یہ محض دو انسان ہیں' بس کی ایک سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو مختلف مسافر۔ ان کی کافی کا کپ' ان کی سگریٹ کی ڈبی اور ان کی خوشبو کی بوتل خالی ہو چکی ہے۔ لڑکی کا کہنا تھا وہ ایسی زندگی پر موت کو فوقیت دے گی' وہ جس دن ایک میز پر بیٹھیں گے اور ان کی گفتگو میں خاموشی کے وقفے طویل ہو جائیں گے وہ اس دن خودکشی کر لے گی۔ لڑکا اس کی قطعی سٹیٹمنٹ سے خوفزدہ ہو گیا' اس نے لڑکی سے پوچھا ''تمہاری نظر میں محبت کیا ہے'' لڑکی نے سرگوشی میں جواب دیا ''محبت گفتگو ہے''۔

نیویارک کے اس اطالوی ریستوران کا کھانا ختم ہو گیا' لڑکی نے بوڑھے جوڑے کی طرف دیکھا اور دونوں اپنی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے' بوڑھے جوڑے کی میز دروازے کے راستے میں تھی' یہ دونوں زیر لب ''چ چ چ'' کرتے ہوئے بوڑھے جوڑے کی میز کے قریب پہنچے' لڑکی نے رحم سے بھری آخری نظر بوڑھے پر ڈالی اور اس کے قدم زمین پر جم کر رہ گئے۔ اس نے دیکھا بابا جی اور اماں جی نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور دونوں ایک ایک ہاتھ سے کھانا کھا رہے تھے' لڑکی بوڑھے جوڑے کی میز پر آ کر رک گئی' اماں جی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' اس کی جھریوں میں اس طرح حرکت ہوئی جس طرح رات کے اندھیرے میں خرگوش اپنی جگہ بدلتا ہے اور اس کی رگڑ سے جھاڑیاں کروٹ لیتی ہیں یا پھر رات کا کوئی پرندہ صبح کے خوف سے درخت سے اپنا رشتہ توڑتا ہے اور درخت کی شاخیں اس کے فراق میں دیر تک کپکپاتی رہتی ہیں۔ اماں جی کی جھریوں میں بھی سرسراہٹ ہوئی اور ممتا کی دعا جیسی چھوٹی سی' موہوم سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آ گئی' اس نے پوپلے منہ سے لڑکی کو ''سدا سہاگن'' کی دعا دی' دعا کی تائید میں بابا جی نے بھی سر ہلایا اور دونوں کو گڈ ٹائمز کہہ دیا۔ لڑکی بھاری قدموں سے ریستوران سے باہر نکل گئی' باہر سڑک پر شور بھی تھا اور روشنیوں کا سیلاب بھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' اس نے لڑکے کا ہاتھ تھاما اور گھٹی گھٹی آواز میں بولی ''جیمز' میرا فلسفہ غلط تھا' محبت گفتگو ہے لیکن محبت کی انتہا خاموشی''۔ جیمز نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا' لڑکی بولی ''اماں جی اور بابا جی نے دو گھنٹے سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا' دونوں ایک ایک ہاتھ سے کھانا کھا رہے تھے' کیا یہ محبت کی انتہا نہیں؟ جیمز مجھے محسوس ہوتا ہے انسان کی محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب خاموشی گفتگو سے ہزار گنا قیمتی ہو جاتی ہے' جب انسان ایک دوسرے کی چپ کو انجوائے کرنے لگتا ہے' جب وہ محبت کے اظہار کیلئے لفظوں اور فقروں کی محتاجی سے نکل جاتا ہے''۔ جیمز نے ہاں میں گردن ہلائی اور نرم آواز میں بولا ''ہاں یہی وجہ ہے انسان جب تک اللہ کے دربار میں لفظوں اور فقروں کے کشکول لے کر جاتا رہتا ہے اس وقت تک اس کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں لیکن جس دن اس کی دعائیں' اس کی التجائیں گونگی ہو جاتی ہیں' وہ حسرت سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور سر زمین کی طرف جھکا دیتا ہے تو اس دن اللہ تعالیٰ اس کی ساری التجائیں سن لیتا ہے''۔

جیمز رکا اور اس نے کہا ''شائد یہی وجہ ہے دنیا کی تمام مقدس عبادت گاہوں میں خاموشی ہوتی ہے' کیوں؟ کیونکہ محبت' عقیدت اور عبادت کی دنیا میں لفظ اضافی ہوتے ہیں' وہاں خاموشی دعا ہوتی ہے''۔



زیرو پوائنٹ

جاوید چودھری

www.facebook.com/javed.chaudhry

ہے سے تھے



جج صاحب صبح جلدی عدالت پہنچ جاتے تھے' سات بجے کام شروع کر دیتے تھے اور شام تک مصروف رہتے تھے' وہ جمعرات 16 مارچ کی صبح بھی پونے سات بجے عدالت پہنچ گئے اور مقدمات کی سماعت شروع کر دی' وکیل جرح کر رہے تھے اور وہ وکیلوں کے دلائل سن رہے تھے' سات بج کر سات منٹ پر جج صاحب کے سینے میں شدید درد اٹھا اور وہ چند سیکنڈ میں پسینے میں بھیگ گئے' انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ دل پر رکھا اور سر میز پر ٹکا دیا' عدالت میں سراسیمگی پھیل گئی' وکلاء خاموش ہو گئے' عدالتی عملے نے بھاگ کر جج صاحب کو سیدھا کیا' وہ پسینے میں شرابور تھے اور اونچی اونچی سانسیں لے رہے تھے' عملے نے پانی پلانے کی کوشش کی لیکن وہ پانی پینے کے قابل نہیں تھے' عدالت کے ایک کونے سے آواز آئی "جج صاحب کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے' آپ انہیں جلدی ہسپتال پہنچاؤ" یہ آواز فیصلہ کن ثابت ہوئی' عملے نے انہیں اٹھایا' گاڑی میں ڈالا اور گاڑی ہسپتال کی طرف دوڑا دی' سول ہسپتال قریب تھا' جج صاحب کو ہسپتال پہنچا دیا گیا' ڈاکٹر جمع ہوئے' ابتدائی طبی امداد دی گئی لیکن جج صاحب کا وقت آ چکا تھا یا پھر دیر ہو چکی تھی' ان کا دل بند ہو گیا اور سانسیں رک گئیں' ڈاکٹروں نے دل کو جھٹکے دیئے' انجیکشن بھی لگایا مگر وہ زندگی کی سرحد سے بہت دور جا چکے تھے' وزیر اعلیٰ نے اپنا خصوصی ہیلی کاپٹر بھجوایا' ان کا جسد خاکی ہیلی کاپٹر میں رکھا گیا اور میت کراچی پہنچا دی گئی۔

یہ جج صاحب جسٹس سعید الدین ناصر تھے' یہ سندھ ہائی کورٹ کے معزز جج تھے' یہ چھ مارچ 2017ء سے حیدر آباد کے سرکٹ بینچ میں شامل تھے' یہ کراچی میں رہتے تھے لیکن مقدمات کی سماعت کیلئے یکم اپریل تک حیدر آباد میں مقیم تھے' یہ صبح جلدی کام شروع کر دیتے تھے' یہ 16 مارچ کی صبح عدالت گئے' پہلا کیس شروع کیا' سماعت کے دوران ہارٹ اٹیک ہوا اور یہ چند منٹوں میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے' مقدمے' فائلیں' وکیل اور فیصلے پیچھے رہ گئے اور یہ چند لمحوں میں مائی لارڈ سے مرحوم مائی لارڈ بن گئے' یہ "ہے سے تھے" ہو گئے' جسٹس سعید الدین ناصر دنیا کی اس اٹل ترین حقیقت کا تازہ ترین ثبوت ہیں جسے ہم روز فراموش کر دیتے ہیں' جسے ہم روز زندگی کے فریب' زندگی کے رنگوں میں بھول جاتے ہیں' وہ حقیقت موت ہے' زندگی بہت مکار ہے' یہ ہمیں یاد ہی نہیں رہنے دیتی ہم نے کبھی مرنا بھی ہے' ہماری موت ہر وقت ہمارے گرد منڈلاتی رہتی ہے' یہ ہمیں کسی لمحے دُبی لے گی زندگی ہمیں یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتی' زندگی اور موت بھی کیا دلچسپ کھیل ہے' مرد کے ایک اختلاط کے دوران 30 کروڑ سپرم خارج ہوتے ہیں' یہ 30 کروڑ سپرم مکمل انسان ہوتے ہیں' عام نارمل مرد میں پانچ ہزار اختلاط کی صلاحیت ہوتی ہے' آپ پانچ ہزار کو 30 کروڑ سے ضرب دیں آپ یہ جان کر حیران رہ جائیں گے قدرت نے ایک مرد کو دنیا کی کل آبادی سے دگنے بچے پیدا کرنے کی صلاحیت دے رکھی ہے لیکن ان اربوں سپرمز میں سے صرف دو چار حد آٹھ دس سپرم انسانی شکل اختیار کرتے ہیں' ان تیس کروڑ انسانوں میں سے صرف ہم پیدا ہو جاتے ہیں' ہماری پیدائش قدرت کے دس عظیم معجزوں میں سے ایک معجزہ ہے' ہماری تخلیق کے پہلے لمحے کے دوران ہمارے اردگرد 30 کروڑ بہن بھائی موجود ہوتے ہیں' یہ خوبصورتی' طاقت' ذہانت اور قسمت میں ہم سے بہتر ہوتے ہیں لیکن قدرت عین وقت پر ہمارے حق میں فیصلہ دے دیتی ہے اور یوں ہم ماں کی کوکھ میں بچ بن جاتے ہیں' یہ ہماری زندگی کے سفر کی شروعات ہیں' آپ آگے کا سفر بھی ملاحظہ کیجئے' دنیا میں ہر سال لاکھوں بچے پیدائش سے پہلے مر جاتے ہیں' یہ "مس کیرج" ہو جاتے ہیں' قدرت ہمیں مس کیرج سے بھی بچا لیتی ہے' دنیا کے 80 فیصد معذور بچے پیدائش کے دوران معذور ہوتے ہیں' بچے کو ڈیلیوری کے دوران آکسیجن نہیں ملتی' سردی یا گرمی لگ جاتی ہے' دائی کا ہاتھ سخت ہو جاتا ہے' ڈیلیوری کے دوران بچے کے سر پر چوٹ لگ جاتی ہے یا پھر ماں "گھٹی" کے نام پر اسے کوئی ایسی چیز کھلا دیتی ہے جسے بچے کا جسم قبول نہیں کرتا اور یوں یہ بے چارہ عمر بھر کیلئے معذور ہو جاتا ہے' قدرت ہمیں معذوری سے بھی بچا لیتی ہے' دنیا کے لاکھوں بچے ابتدائی پانچ برسوں میں فوت ہو جاتے ہیں' یہ خوفناک امراض کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں' پاکستان میں اڑھائی کروڑ بچے سکول کی نعمت سے محروم ہیں' پاکستان دنیا کے ان ملکوں کا حصہ ہے جن میں "ڈراپ آؤٹ" کی شرح انتہائی بلند ہے' ہمارے آدھے بچے پرائمری سے مڈل میں نہیں جاتے' مڈل میں داخل ہونے والے آدھے بچے ہائی سکول نہیں پہنچ پاتے' آپ تعلیم کا المیہ دیکھئے' ہمارے سو بچوں میں سے صرف تین یونیورسٹی پہنچتے ہیں' پاکستان میں اس وقت ستر لاکھ لوگ نشے کے شکار ہیں' نشہ بیچنے والوں کی اکثریت جوانی میں اس لت کا شکار ہوئی' دنیا میں سب سے زیادہ روڈ ایکسیڈنٹ پاکستان میں ہوتے ہیں' ہم ناخالص خوراک بیچنے والے ملکوں میں بھی شمار ہوتے ہیں' ہمارے ملک میں ادویات' پانی اور ہوا بھی خالص نہیں ملتی' ہم مہلک بیماریوں کے سنٹر میں بھی رہتے ہیں' ہم ہیپاٹائٹس سی میں دنیا میں دوسرے نمبر پر ہیں' ہم شوگر کے مرض میں دنیا میں چوتھے نمبر پر ہیں' ہمارے ملک میں تھیلیسیمیا' ٹی بی اور کینسر بھی خطرے کی لکیر سے اوپر ہیں' پاکستان دہشت گردی کے شکار تین بڑے ملکوں میں بھی شمار ہوتا ہے' ہمارے ستر ہزار لوگ دہشت گردی کا لقمہ بن چکے ہیں اور ہم فرقہ واریت کے شکار ملکوں میں بھی شمار ہوتے ہیں چنانچہ آپ کبھی غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک ہمارا وجود ہر لحظہ خطرے کا شکار رہتا ہے اور یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو ہمیں بیماریوں سے لے کر ڈراپ آؤٹ اور نوکری سے لے کر دہشت گردی سے بچاتی رہتی' یہ اللہ کا کرم ہے جس کے صدقے ہم پیدا بھی ہوئے' صحت مند بھی رہے' تعلیم بھی حاصل کی' ترقی بھی کی' بیماریوں' حادثوں اور دہشت گردی سے بھی بچے اور ہم قدرتی آفات سے بھی محفوظ رہے' یہ سب اللہ کا کرم' اللہ کی مہربانی ہے' ہم اللہ کے اس کرم پر جتنا شکر ادا کریں کم ہو گا' ہم اللہ کی اس مہربانی پر جتنا سجدے چلیں وہ بھی کم ہو گا لیکن انسان بدبخت بھی کیا چیز ہے؟ ہم احسان فراموش اور کمینے ہیں' ہم اللہ کی اس مہربانی کو "فار گرانٹڈ" لیتے ہیں' ہم مہلت کو اپنا حق سمجھ لیتے ہیں' ہم خود کو خدا سمجھ بیٹھتے ہیں' میں نے زندگی میں بے شمار جھوٹے خدا دیکھے ہیں' میں آج بھی ہزاروں جھوٹے خدا دیکھتا ہوں' یہ جھوٹے خدا کٹہرے میں کھڑے کر کے جج اور ایس ایچ او سے لے کر وزیراعظم تک ملک کی ہر کرسی' ہر گدی پر بیٹھے ہیں' آپ کسی دن ان خداؤں کی نخوت' ان کا غرور' ان کا تکبر اور ان کے پتھریلے لہجے دیکھیں اور پھر ان کی اوقات پر نظر ڈالیں آپ کو ان پر ترس آئے گا' یہ خدا یہ بھول جاتے ہیں موت روزانہ 65 بار ان کے قریب سے گزرتی ہے' ڈرائیونگ کے دوران اگر ڈرائیور کو نیند یا چکر آ جائے تو یہ خدا کہاں ہوں گے' پانی کا آدھا قطرہ یا چاول کا ایک دانہ ان کی سانس کی نالی میں چلا جائے' اٹھتے ہوئے ان کا گھٹنا ان کا بوجھ نہ اٹھائے اور یہ شیشے کی میز پر گر جائیں' ان کے سر پر گائے سوپ کا سائن بورڈ گر جائے' ان کی گاڑی کا انجن لاک ہو جائے' ان کے پکن کی گیس لیک ہو جائے' ان کی چائے میں چھپکلی گر جائے یا پھر رات سوتے وقت ان کا پنکھا ان کے اوپر گر جائے تو یہ اور ان کی خدائی کہاں جائے گی؟ یہ لوگ کبھی یہ نہیں سوچتے' ہم اگر یہ سوچ بھی لیں' ہم اگر ان سارے حادثوں سے بچ بھی جائیں تو بھی ہم موت کے ساڑھے چار ہزار بہانے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں' ہمارے خلیوں میں ساڑھے چار ہزار بیماریاں موجود رہتی ہیں' ان میں سے کسی بھی وقت کوئی بھی ایکٹو ہو جاتی ہے اور ہم کرسی پر بیٹھے بیٹھے "ہے سے تھے" ہو جاتے ہیں' ہم آنجہانی یا مرحوم ہو جاتے ہیں اور ہمارے بعد ہماری کرسی' ہماری گدی اور ہماری مسند پر کوئی دوسرا خدا بیٹھ جاتا ہے اور بات ختم۔

میں روز اخبارات کھولنے کے بعد سب سے پہلے انتقال کی خبریں پڑھتا ہوں' میں اس کے بعد حادثوں کی خبریں پڑھتا ہوں اور پھر اپنے آپ سے پوچھتا ہوں "یہ لوگ بھی کل تک زندہ تھے' یہ لوگ بھی کل تک امیر' طاقتور' خوبصورت' متحرک اور عقل مند تھے لیکن یہ آج کہاں ہیں" میں اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں اور پھر مزید ایک دن کی مہلت ملنے پر اس کا شکر ادا کرتا ہوں' یہ شکر اور یہ توبہ میری روز کی عبادت' میرا روز کا معمول ہے' کاش ہم سب اللہ کی مہلت پر شکر اور توبہ کو اپنا معمول بنا لیں' کاش ہم یہ جان لیں وہ اللہ جو کرسی پر جسٹس سعید الدین ناصر کی جان قبض کر سکتا ہے وہ ہمیں بھاگنے کا موقع کہاں تک دے گا' وہ ہمیں مزید کتنا وقت دے گا تو شاید ہماری یہ عارضی زندگی بہتر ہو جائے' ہم شاید تکبر اور لالچ سے بچ جائیں چنانچہ میری آپ سے درخواست ہے اللہ سے توبہ کریں' شکر ادا کریں' روز ایک نیکی کریں اور روز ایک گناہ' ایک کوتاہی ترک کرنے کا عزم کریں شاید اللہ تعالیٰ کو ہم پر رحم آ جائے' شاید یہ ہماری زندگی کو بابرکت بنا دے' شاید یہ تھے سے پہلے ہمارے ہے کو اچھا بنا دے۔

روزنامہ "ایکسپریس" گوجرانوالہ' منگل' 28 جمادی الثانی 1438ھ' 14 چیت 2074ب' 28 مارچ 2017ء

تین لکیریں

زیرو پوائنٹ

جاوید چودھری



www.facebook.com/javed.chaudhry

میں اداسی میں اکثر کسی جھیل' کسی آبشار یا کسی جنگل میں جا بیٹھتا ہوں اور میں اس وقت تک وہاں بیٹھا رہتا ہوں جب تک میرا دل ہلکا نہیں ہو جاتا' میں 2011ء میں بھی اسی قسم کی صورتحال کا شکار تھا' میرا دل بھاری تھا' میں شدید ڈپریشن کا شکار تھا' میں سوئٹزرلینڈ کے ایک غیر معروف گاؤں میں تھا' میں نے وہاں ایک قبر پر سرخ گلابوں کا گل دستہ رکھا' فاتحہ پڑھی اور قبرستان کی سیڑھیاں اترتے اترتے نیچے جھیل تک چلا گیا۔

دنیا میں سب سے زیادہ پہاڑ سوئٹزرلینڈ میں ہیں' یہ پہاڑی ملک ہے' آپ کسی شہر' کسی قصبے یا کسی گاؤں میں چلے جائیں پہلے آپ کی ملاقات پہاڑ سے ہو گی پھر آپ کسی نہ کسی جھیل سے ملیں گے اور آپ آخر میں گاؤں یا قصبے میں داخل ہو جائیں گے' میں بھی ایک ایسے ہی گاؤں میں تھا' وہ گاؤں پہاڑ کی ترائیوں پر آباد تھا' میں نے دنیا میں اس گاؤں کے قبرستان سے زیادہ خوبصورت قبرستان نہیں دیکھا' میرا ایک عزیز دوست اس قبرستان میں دفن ہے' میں 2011ء سے وہاں جا رہا ہوں' میں قبر پر پھول چڑھاتا ہوں اور قبرستان سے اترتا ہوا جھیل تک چلا جاتا ہوں' گاؤں کے نیچے سوئٹزرلینڈ کی تیسری بڑی جھیل ہے' یہ جھیل' جھیل کم اور سمندر زیادہ دکھائی دیتی ہے' جھیل میں بحری جہاز چلتے ہیں' میرا دل اس دن بہت اداس تھا' میں سیڑھیاں اترتے اترتے جھیل کے کنارے پہنچ گیا اور وہاں آہستہ آہستہ واک کرنے لگا' مجھے ٹینشن' ڈپریشن اور اداسی میں پانی کے ساتھ آہستہ واک ہمیشہ سوٹ کرتی ہے' میں واک کرتے کرتے جھیل کے آخری سرے تک پہنچ گیا' جھیل کے آخر میں تین قلعہ نما گھر تھے' وہ گھر چٹان پر بنے ہوئے تھے' پتھر کی سیڑھیاں پانی تک آتی تھیں' سیڑھیوں کے آخر میں چھوٹی چھوٹی تین گودیاں تھیں اور ان گودیوں میں نیلے اور سفید رنگ کی تین موٹر بوٹس کھڑی تھیں' گھروں کے پیچھے سرسبز پہاڑ تھا' گھر کا پچھلا راستہ پہاڑ کی طرف کھلتا تھا' وہ راستہ آگے چل کر واکنگ ٹریک بن جاتا تھا' گھروں کو سرخ' پنک اور سفید بوگن بیل کے لاکھوں پھولوں نے ڈھانپ رکھا تھا' سبز پہاڑ' سبز پہاڑ کے قدموں میں تین قلعہ نما گھر اور گھروں کے قدموں میں جھیل' میں وہ منظر دیکھ کر رک گیا' وہ منظر' منظر نہیں تھا وہ کیلنڈر کی خوبصورت تصویر تھا' شام کے رنگ گہرے ہو رہے تھے' جنگلی پرندے اور سفید بگلے ان گہرے ہوتے رنگوں میں آب حیات گھول رہے تھے' میں گھروں کے قدموں میں پتھر کے بینچ پر بیٹھ گیا' مجھے محسوس ہوا دنیا کے تمام مناظر روز اس منظر کا طواف کرنے یہاں آتے ہوں گے' وہ یہاں ماتھا ٹیک کر آگے جاتے ہوں گے' میں بڑی دیر وہاں بیٹھا رہا' میں محویت میں کبھی پہاڑوں کی طرف دیکھتا تھا' کبھی جھیل میں گم ہو جاتا تھا اور کبھی سرخ' پنک اور سفید پھولوں میں چھپے مکانوں کو دیکھنے لگتا' سکوت کے اس عالم میں اچانک ایک آواز گونجی "آپ کافی میں چینی لیتے ہیں" آواز مردانہ تھی' لہجہ ہندوستانی تھا اور الفاظ اردو کے تھے' میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا' مکان کی کھڑکی میں ایک بوڑھا ہندوستانی کھڑا تھا' وہ مسکرا کر میری طرف دیکھ رہا تھا' چہرے پر اپنائیت تھی' میں نے اونچی آواز میں جواب دیا "میں چینی نہیں لیتا" اس نے قہقہہ لگایا' پھر "سیم پرابلم" کا نعرہ لگایا اور غائب ہو گیا' میں نے تھوڑی دیر بعد اسے سیڑھیاں اترتے دیکھا' اس کے دونوں ہاتھوں میں کافی کے مگ تھے' وہ سیڑھیاں اتر کر میرے پاس پہنچا' مگ بینچ پر رکھے اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا "مائی نیم از موہن" میں نے بھی اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا' موہن کا ہاتھ بہت نرم تھا' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کسی مچھلی سے ہاتھ ملا لیا ہے' وہ میرے ساتھ بینچ پر بیٹھ گیا۔

وہ بھارت کے شہر چنائی کا رہنے والا تھا' بزنس مین تھا' تین میں سے ایک مکان اس کی ملکیت تھا' وہ ہر دو ماہ بعد ایک ہفتے کیلئے وہاں آتا تھا' کشتی رانی کرتا تھا' پہاڑ پر ٹریکنگ کرتا تھا اور کتابیں پڑھتا تھا' وہ غالب کا فین تھا' اسے غالب کے درجنوں شعر یاد تھے' وہ مجھے شروع میں ہندوستانی سمجھا' پھر اس نے اندازہ لگایا ہندوستان کا کوئی شہری دو گھنٹے تک کرنہیں بیٹھ سکتا۔ "تم ہو نہ ہو' تم پاکستانی ہو" میں نے سوچا' میں نے کافی بنائی' چینی کا پوچھا اور کافی لے کر تمہارے پاس آ گیا" ہم سورج ڈوبنے تک گپیں مارتے رہے' وہ مجھے اس کے بعد گھر کے اندر لے گیا' وہ گھر اندر سے بہت خوبصورت تھا' لکڑی کی اونچی چھتیں' پرانا ڈکورین فرنیچر' دو دو ٹن بھاری بیڈ اور پتھر کی پرانی فائر پلیسز' وہ گھر نہیں محل تھا' موہن نے بتایا' یہ گھر ڈیڑھ سو سال پرانا ہے اور یہ اس نے دو سال پہلے دس ملین ڈالر میں خریدا تھا "مجھے یہاں بہت شانتی ملتی ہے" اس نے بڑے فخر سے کہا' میں نے جواب دیا' "آپ کو اگر شانتی نہ ملتی تو آپ دس ملین ڈالر کیوں خرچ کرتے" اس نے قہقہہ لگا کر سر ہاں میں ہلا دیا' میں نے اس سے پوچھا "آپ نے بزنس کب شروع کیا تھا" اس نے قہقہہ لگایا اور بولا "میں اس وقت پندرہ سال کا لڑکا تھا" میں غور سے موہن کی طرف دیکھنے لگا' موہن نے اس کے بعد بڑی دلچسپ داستان سنائی۔

وہ جھونپڑ پٹی سے تعلق رکھتا تھا' باپ شراب پی پی کر مر گیا' ماں نے اسے دوسروں کے گھروں میں برتن اور کپڑے دھو کر پالا' وہ پندرہ سال کا تھا تو اس نے چائے کا چھوٹا سا کھوکھا بنا لیا' وہ کھوکے کا مالک بھی تھا' کک بھی اور ویٹر بھی' وہ روز سو ڈیڑھ سو روپے کما لیتا تھا' گھر میں خوش حالی آ گئی مگر وہ مزید ترقی کرنا چاہتا تھا' چنائی یونیورسٹی کا ایک پروفیسر صبح کے وقت اس کے کھوکے سے چائے پیتا تھا' وہ بچے کی محنت پر خوش تھا' وہ اسے روز کوئی نہ کوئی نئی بات سکھاتا تھا' موہن نے ایک دن پروفیسر سے پوچھا "ماسٹر کیا میں بھی بڑا آدمی بن سکتا ہوں" پروفیسر نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "دنیا کا ہر شخص بڑا آدمی بن سکتا ہے" موہن کا اگلا سوال تھا "کیسے؟" پروفیسر نے اپنے بیگ سے چاک نکالا' موہن کے کھوکے کے پاس پہنچا' دائیں سے بائیں تین لکیریں لگائیں' پہلی لکیر پر محنت' محنت اور محنت لکھا' دوسری لکیر پر ایمانداری' ایمانداری اور ایمانداری لکھا اور تیسری لکیر پر صرف ایک لفظ ہنر (سکل) لکھا۔ موہن پروفیسر کو چپ چاپ دیکھتا رہا' پروفیسر یہ لکھنے کے بعد موہن کی طرف مڑا اور بولا "ترقی کے تین زینے ہوتے ہیں' پہلا زینہ محنت ہے' آپ جو بھی ہیں' آپ اگر صبح' دوپہر اور شام تین اوقات میں محنت کر سکتے ہیں تو آپ تیس فیصد کامیاب ہو جائیں گے' آپ کوئی سا بھی کام شروع کر دیں آپ کی دکان' فیکٹری' دفتر یا کھوکھا صبح سب سے پہلے کھلنا چاہیے اور رات کو آخر میں بند ہونا چاہیے' آپ کامیاب ہو جائیں گے" پروفیسر نے کہا "ہمارے گرد موجود نوے فیصد لوگ سست ہیں' یہ محنت نہیں کرتے' آپ جوں ہی محنت کرتے ہیں آپ نوے فیصد سست لوگوں کی فہرست سے نکل کر دس فیصد محنتی لوگوں میں آ جاتے ہیں' آپ ترقی کیلئے اہل لوگوں میں شمار ہونے لگتے ہیں' اگلا مرحلہ ایمانداری ہوتی ہے' ایمانداری چار عادتوں کا پیکج ہے' وعدے کی پابندی' جھوٹ سے نفرت' زبان پر قائم رہنا اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنا' آپ محنت کے بعد ایمانداری کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لو' وعدہ کرو تو پورا کرو' جھوٹ کسی قیمت پر نہ بولو' زبان سے اگر ایک بار بات نکل جائے تو آپ اس پر ہمیشہ قائم رہو اور ہمیشہ اپنی غلطی' کوتاہی اور خامی کا آگے بڑھ کر اعتراف کرو' تم ایماندار ہو جاؤ گے اور کاروبار میں اس ایمانداری کی شرح 50 فیصد ہوتی ہے' آپ پہلا تیس فیصد محنت سے حاصل کرتے ہیں' آپ کو دوسرا پچاس فیصد ایمانداری دیتی ہے اور پیچھے رہ گیا 20 فیصد تو یہ 20 فیصد ہنر ہوتا ہے' آپ کا پروفیشنل ازم' آپ کی سکل اور آپ کا ہنر آپ کو باقی 20 فیصد بھی دے دے گا' آپ سو فیصد کامیاب ہو جاؤ گے" پروفیسر نے موہن کو بتایا "لیکن یہ یاد رکھو ہنر' پروفیشنل ازم اور سکل کی شرح صرف 20 فیصد ہے اور یہ 20 فیصد بھی آخر میں آتا ہے' آپ کے پاس اگر ہنر کی کمی ہے تو بھی آپ محنت اور ایمانداری سے 80 فیصد کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا آپ بے ایمان اور سست ہوں اور آپ صرف ہنر کے زور پر کامیاب ہو جائیں' آپ کو محنت ہی سے سٹارٹ لینا ہو گا' آپ کو ایمانداری کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنانا ہو گا اور آپ کو آخر میں خود کو ہنر مند ثابت کرنا ہو گا" پروفیسر نے موہن کو بتایا' میں نے دنیا کے بے شمار ہنر مندوں اور فنکاروں کو بھوکے مرتے دیکھا' کیوں؟ کیونکہ وہ بے ایمان بھی تھے اور سست بھی اور میں نے دنیا کے بے شمار بے ہنروں کو ذاتی جہاز اڑاتے دیکھا' کیوں؟ کیونکہ وہ ایماندار اور محنتی تھے' پروفیسر نے اپنا چاک بیگ میں رکھا' موہن کی ناک چھوئی اور بولا "تم ان تین لکیروں پر چلنا شروع کر دو' تم آکاش تک پہنچ جاؤ گے" موہن نے لمبا سانس لیا اور بولا "میں نے چاک سے بنی ان تین لکیروں کو اپنا مذہب بنا لیا اور میں 45 سال کی عمر میں ارب پتی ہو گیا" موہن نے بتایا' کھوکھے کی وہ دیوار اور اس دیوار کی وہ تین لکیریں آج بھی میرے دفتر میں میری کرسی کے پیچھے لگی ہیں' میں دن میں بیسیوں مرتبہ وہ لکیریں دیکھتا ہوں اور پروفیسر کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں"۔

موہن خاموش ہو گیا' سورج نے جھیل میں ڈبکی لگا دی' شام رات میں تبدیل ہونے لگی' موہن کے گھر سے شام کا منظر بہت خوبصورت تھا' گھر کی ساری کھڑکیاں پینٹنگ بن چکی تھیں اور ہر پینٹنگ منہ کھول کر سانس لے رہی تھی' موہن کی کامیابی کی تین لکیروں کی طرح۔

اللہ تعالیٰ کے سو احکامات

یہ چند برس پرانی بات ہے' ایک امریکی نومسلم نے قرآن مجید سے حقوق العباد سے متعلق اللہ تعالیٰ کے 100 احکامات جمع کئے' یہ احکامات پوری دنیا میں پھیلے مسلم سکالرز کو بھجوائے اور پھر ان سے نہایت معصومانہ سا سوال کیا "ہم مسلمان اللہ تعالیٰ کے ان احکامات پر عمل کیوں نہیں کرتے" مسلم سکالرز کے پاس اس معصومانہ سوال کا کوئی جواب نہیں تھا' مجھے چند دن قبل ایک دوست نے یہ احکامات "فارورڈ" کر دیئے' میں نے پڑھے اور میں بڑی دیر تک اپنے آپ سے پوچھتا رہا" ہمارے رب نے ہمیں قرآن مجید کے ذریعے یہ احکامات دے رکھے ہیں' ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ان احکامات پر پورا اترتے ہیں" میں یہ احکامات سو نمبر کا پرچہ سمجھ کر ترجمہ کر رہا ہوں اور میں یہ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں' آپ پہلے یہ پرچہ حل کریں' پھر خود اس کی مارکنگ کریں' پھر اپنے پاس یا فیل ہونے کا فیصلہ کریں اور آخر میں یہ سوچیں ہم قیامت کے دن کیا منہ لے کر اپنے رب کے سامنے پیش ہوں گے' آپ کا یہ جواب فیصلہ کرے گا ہم کتنے مسلمان ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا" ایک' گفتگو کے دوران بدتمیزی نہ کیا کرو' حکم دیا' دو' غصے کو قابو میں رکھو' تین' دوسروں کے ساتھ بھلائی کرو' چار' تکبر نہ کرو' پانچ' دوسروں کی غلطیاں معاف کر دیا کرو' چھ' لوگوں کے ساتھ آہستہ بولا کرو' سات' اپنی آواز نیچی رکھا کرو' آٹھ' دوسروں کا مذاق نہ اڑایا کرو' نو' والدین کی خدمت کیا کرو' دس' منہ سے والدین کی توہین کا ایک لفظ نہ نکالو' گیارہ' والدین کی اجازت کے بغیر ان کے کمرے میں داخل نہ ہوا کرو' بارہ' حساب لکھ لیا کرو' تیرہ' کسی کی اندھا دھند تقلید نہ کرو' چودہ' اگر مقروض مشکل وقت سے گزر رہا ہو تو اسے ادائیگی کیلئے مزید وقت دے دیا کرو' پندرہ' سود نہ کھاؤ' سولہ' رشوت نہ لو' سترہ' وعدہ نہ توڑو' اٹھارہ' دوسروں پر اعتماد کیا کرو' انیس' سچ میں جھوٹ نہ ملایا کرو' بیس' لوگوں کے درمیان انصاف قائم کیا کرو' اکیس' انصاف کیلئے مضبوطی سے کھڑے ہو جایا کرو' بائیس' مرنے والوں کی دولت خاندان کے تمام ارکان میں تقسیم کیا کرو' تیئس' خواتین بھی وراثت میں حصہ دار ہیں' چوبیس' یتیموں کی جائیداد پر قبضہ نہ کرو' پچیس' یتیموں کی حفاظت کرو' چھبیس' دوسروں کا مال بلا ضرورت خرچ نہ کرو' ستائیس' لوگوں کے درمیان صلح کراؤ' اٹھائیس' بدگمانی سے بچو' انتیس' غیبت نہ کرو' تیس' جاسوسی نہ کرو' اکتیس' خیرات کیا کرو' بتیس' غرباء کو کھانا کھلایا کرو' تینتیس' ضرورت مندوں کو تلاش کر کے ان کی مدد کیا کرو' چونتیس' فضول خرچی نہ کیا کرو' پینتیس' خیرات کر کے جتلایا نہ کرو' چھتیس' مہمانوں کی عزت کیا کرو' سینتیس' نیکی پہلے خود کرو اور پھر دوسروں کو تلقین کرو' اڑتیس' زمین پر برائی نہ پھیلایا کرو' انتالیس' لوگوں کو مسجدوں میں داخلے سے نہ روکو' چالیس' صرف ان کے ساتھ لڑو جو تمہارے ساتھ لڑیں' اکتالیس' جنگ کے دوران جنگ کے آداب کا خیال رکھو' بیالیس' جنگ کے دوران پیٹھ نہ دکھاؤ' تینتالیس' مذہب میں کوئی سختی نہیں' چالیس' تمام انبیاء پر ایمان لاؤ' پینتالیس' حیض کے دنوں میں مباشرت نہ کرو' چھیالیس' بچوں کو دو سال تک ماں کا دودھ پلاؤ' سینتالیس' جنسی بدکاری سے بچو' اڑتالیس' حکمرانوں کو میرٹ پر منتخب کرو' انچاس کسی پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو' پچاس' نفاق سے بچو' اکاون' کائنات کی تخلیق اور عجائب کے بارے میں گہرائی سے غور کرو' باون' عورتیں اور مرد اپنے اعمال کا برابر حصہ پائیں گے' ترپن' خونی رشتوں میں شادی نہ کرو (کزن میرج)' چون' مرد کو خاندان کا سربراہ ہونا چاہیے' پچپن' بخیل نہ بنو' چھپن' حسد نہ کرو' ستاون' ایک دوسرے کو قتل نہ کرو' اٹھاون' فریب (فرہبی) کی وکالت نہ کرو' انسٹھ' گناہ اور شدت میں دوسروں کے ساتھ تعاون نہ کرو' ساٹھ' نیکی میں ایک دوسری کی مدد کرو' اکسٹھ' اکثریت سچ کی کسوٹی نہیں ہوتی' باسٹھ' صحیح راستے پر رہو' تریسٹھ' جرائم کی سزا دے کر مثال قائم کرو' چونسٹھ' گناہ اور ناانصافی کے خلاف جدوجہد کرتے رہو' پینسٹھ' مردہ جانور' خون اور سور کا گوشت حرام ہے' چھیاسٹھ' شراب اور دوسری منشیات سے پرہیز کرو' ساٹھ' جوا نہ کھیلو' اڑسٹھ' ہیرا پھیری نہ کرو' ستر' کھاؤ اور پیو لیکن اصراف نہ کرو' اکہتر' نماز کے وقت اچھے کپڑے پہنو' بہتر' آپ سے جو لوگ مدد اور تحفظ مانگیں ان کی حفاظت کرو' انہیں مدد دو' تہتر' طہارت قائم رکھو' چوہتر' اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو' پچہتر' اللہ نادانستگی میں کی جانے والی غلطیاں معاف کر دیتا ہے' چھہتر' لوگوں کو دانائی اور اچھی ہدایت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاؤ' ستتر' کوئی شخص کسی کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا' اٹھہتر' غربت کے خوف سے اپنے بچوں کو قتل نہ کرو' اناسی' جس کے بارے میں علم نہ ہو اس کا پیچھا نہ کرو' اسی' پوشیدہ چیزوں سے دور رہا کرو (کھوج نہ لگاؤ)' اکیاسی' اجازت کے بغیر دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہو' بیاسی' اللہ اپنی ذات پر یقین رکھنے والوں کی حفاظت کرتا ہے' تراسی' زمین پر عاجزی کے ساتھ چلو' چوراسی' دنیا سے اپنے حصے کا کام مکمل کر کے جاؤ' پچاسی' اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' چھیاسی' ہم جنس پرستی میں نہ پڑو' ستاسی' صحیح (سچ) کا ساتھ دو' غلط سے پرہیز کرو' اٹھاسی' زمین پر ڈھٹائی سے نہ چلو' نواسی' عورتیں اپنی زینت کی نمائش نہ کریں' نوے' اللہ شرک کے سوا تمام گناہ معاف کر دیتا ہے' اکانوے' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' بانوے' برائی کو اچھائی سے ختم کرو' ترانوے' فیصلے مشاورت کے ساتھ کیا کرو' چورانوے' تم میں وہ زیادہ معزز ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے' پچانوے' مذہب میں رہبانیت نہیں' چھیانوے' اللہ علم والوں کو مقدم رکھتا ہے' ستانوے' غیر مسلموں کے ساتھ مہربانی اور اخلاق کے ساتھ پیش آؤ' اٹھانوے' خود کو لالچ سے بچاؤ' ننانوے' اللہ سے معافی مانگو' یہ معاف کرنے اور رحم کرنے والا ہے اور سو "جو شخص دست سوال دراز کرے اسے انکار نہ کرو"۔

اللہ تعالیٰ کے یہ سو احکامات حقوق العباد ہیں' ہم جب تک سو نمبروں کے اس پرچے میں پاس نہیں ہوتے ہم اس وقت تک مسلمان ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اللہ کا قرب حاصل کر سکتے ہیں خواہ ہم پوری زندگی سجدے میں گزار دیں یا پھر خانہ کعبہ کی چوکھٹ پر جان دے دیں' آپ یہ پرچہ حل کریں' مارکنگ کریں اور اپنے گریڈز کا فیصلہ خود کر لیں۔ مجھے یقین ہے میرے سمیت کوئی مسلمان اس امتحان میں پاس نہیں ہو سکے گا' آپ گفتگو میں بدتمیزی سے لے کر بھکاری کا ہاتھ جھٹکنے تک اللہ کا کوئی حکم لے لیجئے آپ خود کو خدا کا نافرمان پائیں گے' ہم اللہ کے نام پر مرنے اور مارنے کیلئے تیار رہتے ہیں لیکن ہم اللہ کا کوئی حکم ماننے کیلئے رضامند نہیں ہیں' اللہ نے ہم انسانوں کو سمجھانے کیلئے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اور چار کتابیں نازل کیں ہم نے کتابوں پر عمل کیا اور نہ ہی انبیاء کی سنی' آپ اللہ تعالیٰ کے احکامات کا تجزیہ کر لیجئے آپ کو اللہ کے نوے فیصد احکامات حقوق العباد اور دس فیصد عبادات پر مبنی ملیں گے' اللہ تعالیٰ عبادات کے اندر بھی انسانوں کے حقوق کو مقدم رکھتا ہے' مسجد میں بھی اگر ہمارے سجدے دوسروں کے سجدوں کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں تو اللہ ہمارے سجدے قبول نہیں کرتا خواہ ہم خشوع اور خضوع کی انتہا کو ہی کیوں نہ چھو لیں' اللہ تعالیٰ اس مسجد کو بھی مسجد نہیں سمجھتا جو راستے میں بنائی گئی ہو یا قبضے کے پلاٹ پر تعمیر کی گئی ہو' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان عبادتوں کو بھی عبادت گزاروں کے منہ پر مار دے گا جو حقوق العباد کو روند کر ادا کی گئی ہوں گی اور ہمارا رب اس قدر کریم اور مہربان ہے کہ یہ صدقے کا پہلا حق دار بھی خاندان کو قرار دیتا ہے' یہ کمانے والے کی ذات کو کمائی کا پہلا حق دیتا ہے لیکن ہم کیا ہیں؟ ہم اپنے خالی' اپنے کھوکھلے وجود کو مہنگے' مہنگے کپڑیاں اور ٹوپیاں پہنا کر' ہم اخلاقیات سے بے بہرہ جسم کو داڑھیاں رکھوا کر اور ہم برائیوں' بے ایمانیوں اور گستاخیوں کے ڈھیر پر جائے نماز بچھا کر خود کو دنیا کی مقدس اور متبرک ترین قوم سمجھتے ہیں' ہم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے باوجود خود کو اللہ تعالیٰ کے ٹھیکیدار بھی سمجھتے ہیں' ہمیں یہ ماننا ہوگا ہم اپنے رب کے نافرمان ہیں اور رب اپنے نافرمانوں کے پاس قبلہ اول تو کیا قبلہ دوم بھی نہیں رہنے دیتا' یہ ان سے ان کی سجدہ گاہیں تک چھین لیا کرتا ہے اور یہ ان کی دعاؤں سے اثر اڑا دیا کرتا ہے' ہم بھی کیا لوگ ہیں؟ ہم قبضے کے پلاٹوں' راستوں اور گرین بیلٹس پر مسجدیں بنا کر یہودیوں کو قبلہ اول کا قبضہ چھوڑنے کا حکم دیتے ہیں' ہم اپنے بچوں کو دودھ میں کھاد ملا کر پلاتے ہیں' مسلمان مسلمان کو گدھے کا گوشت کھلاتا ہے لیکن یہ پوری مسلم امہ کو یہودی مشروبات اور کھانے کے یہودی برانڈ ترک کرنے کا مشورہ دیتا ہے' ہمیں اگر اللہ کی نصرت چاہیے تو ہمیں اللہ کے احکامات پر عمل کرنا ہوگا' ہم کب تک اللہ اللہ کا ورد کر کے اللہ کو دھوکا دیتے رہیں گے' اللہ تعالیٰ ہم سب کے مکر اور فریب سے بھی واقف ہے اور یہ ہمارے دلوں کا حال بھی خوب جانتا ہے' ہمیں ماننا ہوگا اللہ کا جو بندہ اللہ کی نہیں مانتا اللہ اس کی نہیں سنتا۔



زیرو پوائنٹ

جاوید چودھری

www.facebook.com/javed.chaudhry

★★★★★

کالے قول

حکمران بے شک بے ایمان رہیں لیکن عوام کو بے ایمانی میں ''ڈسکاؤنٹ'' ہی دے دیں تو عوام کی حالت تبدیل ہوسکتی ہے۔

جیسے گھوڑا گھاس سے دوستی کرکے زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح آدم خور آدمی سے دوستی افورڈ نہیں کرسکتا۔

پھل پھول افلاک نہیں، خاک سے اٹھتے ہیں۔

کینچلی نہیں، کیریکٹر تبدیل کرو۔

جو یہی نہیں جانتا کہ جا کہاں رہا ہے اس کی منزل کیسی؟

اولاد کی دیکھ بھال امانت کی طرح کرنا ہی دیانت ہے۔

ستاروں کی چال نہیں، اپنے چال چلن پر نظر رکھو۔

کچھ لوگوں کی ''روحانیت'' بھی آلودگی کا شکار ہوجاتی ہے۔

جو خود کو بہت مذہبی یا محب وطن کے طور پر پیش کرے، اس سے محتاط رہو۔

سیاسی اور مذہبی اجتماعات کے انجام یا درمیان میں جس طرح عوام کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اس طرح تو بھوکا جانور چارے پر نہیں ٹوٹ پڑتا لیکن ان کے رہنماؤں کو پھر بھی شرم نہیں آتی کیونکہ یہی تو وہ چاہتے ہیں۔

ہوائی قلعے زمین پر بنانے پڑیں تو بہت مہنگے پڑتے ہیں۔

خوابوں کی تعبیر خوابوں میں نہیں ملتی۔

کچھ افراد اور اقوام کو جیتنے اور کچھ کو ہارنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔

بغیر قیمت کے زندگی میں صرف ذلت ہی مل سکتی ہے۔

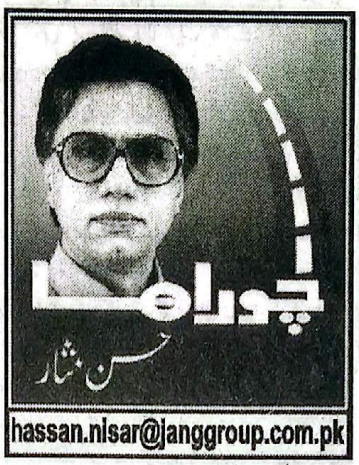
فتح..... شکست سے جنگ جاری رکھنے کا نام ہے۔

بزرگ کہا کرتے تھے ''کون کسی کو کچھ دے سکتا ہے کہ دینے والے نے دیئے ہوئے میں سے ہی تو دینا ہوتا ہے''۔

زندگی کے بارے میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ زندگی کے بعد اس سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔

احمقوں کو نصیحتیں کرنے، پانی پر تصویر بنانے، ریت سے دیوار اٹھانے میں کیا فرق ہے؟

کچھ لوگ خود کو بہت سستا بیچنے پر یہ سوچتے ہیں کہ



مہنگے بک گئے۔

خواب چھن جانے سے بہتر ہے آنکھوں سے نور چھن جائے۔

دنیا میں کبھی دن ہوا نہ رات کیونکہ کہیں دن تو کہیں رات ہوتی ہے سو نہ کبھی چاند غروب ہوتا ہے نہ سورج۔

کبھی کبھی ڈاکو بھی لوٹ کے مال کو مال غنیمت قرار دے دیتے ہیں۔

قطری و دیگر شہزادوں کو دیکھ کر خیال گزرا کہ شہزادے بھی شتربانوں اور کوچوانوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ کیمرہ ایجاد نہ ہوتا تو میں شہزادوں کو شہزادے ہی سمجھتا رہتا۔

کچھ لوگوں کا تعلق کردار سے نہیں جھنکار سے ہوتا ہے اور گھنگھروان کی ایڑیوں کے اندر چھپے ہوتے ہیں۔

شیخ چلی ہونے کے لئے ''شیخ'' ہونا ضروری نہیں، آپ سیاستدان بھی ہوسکتے ہیں۔

ٹیکنالوجی نے مستقبل کی تعریف بدل دی اور یہی زمین پر آخری منصف بھی ہوگی۔

گھر جل رہا ہو تو اس آگ سے محظوظ نہیں ہونا چاہئے۔

پانی کچے گھڑے کو پی جاتا ہے

کچھ چیزوں کا روشن پہلو تلاش کرنے سے آنکھیں اندھی ہوجاتی ہیں۔

زندہ لوگوں کو زندگی کے اعلان نہیں کرنا پڑتے۔

بولنا تو قدرت سکھاتی ہے، خاموشی خود سیکھنی پڑتی ہے۔

مسکراہٹ ہر ملک کی کرنسی اور زبان ہے۔

جس کام میں جی لگے، اسی میں جان لگاؤ۔

پہاڑ پر سیدھا جانے کے لئے بھی ٹیڑھا ہونا پڑتا ہے۔

''کردار'' خالص کھانے کی طرح گھر پر ہی تیار ہوتا ہے۔

جس گھر میں لائبریری نہیں اس میں آکسیجن کی کمی ہوتی ہے۔

اگر شکلیں ایک جیسی نہیں تو عقلیں کیسے ہوسکتی ہیں۔

یہاں تو اداکارہ ''میرا'' بھی یہی کہتی ہے کہ اس نے ملک کا نام روشن کیا۔

دنیا کے کسی قانون میں بے وقوفی کے لئے کوئی سزا نہیں۔

قدرت کو عجلت پسند ہوتی تو وہ سو سالہ برگد ایک لمحہ میں اگا سکتی تھی۔

انسان کو انسانی جسم اور انسانی معاشرہ میں گہری مماثلت کی سمجھ آجائے تو اسے قرار مل جائے۔

حکومتیں بھکاریوں کے سپرد نہیں کی جاسکتیں ..... خصوصاً ووٹوں کے بھکاری۔

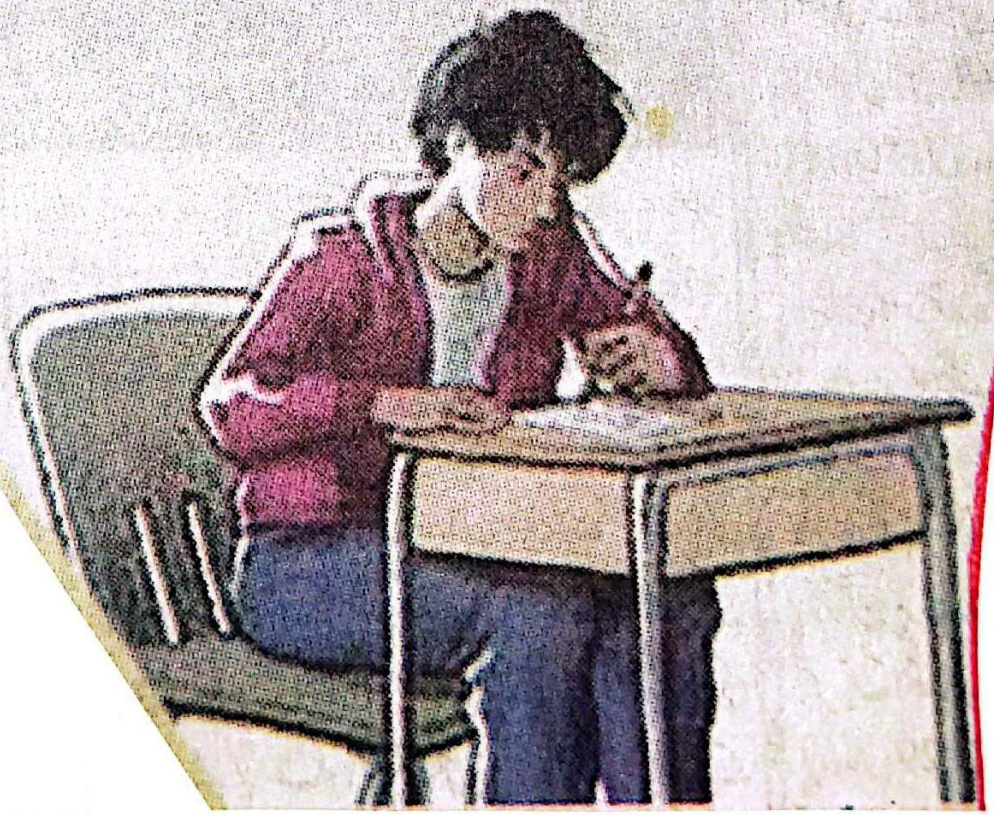
ہم اس وقت تک ''ٹرک'' کی بتی کے پیچھے بھاگتے رہیں گے جب تک ٹرک کا ''ایکسیڈنٹ'' نہیں ہوجاتا۔

انسان زندگی بھر اکثر یہی نہیں جان پاتا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔

کامیابی اور خوشی میں سے کسی ایک کا انتخاب زندگی کا مشکل ترین فیصلہ ہوتا ہے۔

مجھے پھر اسکول کا بستہ تھما دو ماں

مجھے زندگی کا سبق بہت مشکل لگتا ہے



عبدالحفیظ ظفر

خودکشی کرنے والے شاعر اور ادیب

ان میں سے بعض کا تعلق پاکستان سے بھی ہے

ایک فلمی شاعر نے کہا تھا ''زندگی جا چھوڑ دے پیچھا میرا'' آخر میں انسان ہوں پتھر تو نہیں'' الجزائر کے مشہور مفکر اور ناول نگار البیر کامیو کا کہنا ہے جب زندگی موت سے بھی زیادہ اذیت ناک ہو جائے تو خودکشی کرنا لازم ہے۔ زندگی کی بے ثباتی اور لایعنیت سے آخر کون لوگ اتنے مایوس ہو جاتے ہیں کہ موت کی گلے لگا لیتے ہیں۔ ان میں کچھ تو نفسیاتی مریض ہوتے ہیں اور دوسرے اپنے تئیں اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ موت کا خوف بے معنی ہے، البتہ زندگی کی سفاکیوں اور ستم کاریوں سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس سے جان چھڑا لی جائے۔ ایک اور شاعر نے غالباً اسی حوالے سے کہا تھا

موت کا کچھ نہیں ہے خوف مجھے
تو مجھے زندگی سے ڈرنے دے

بہرحال ایک بات تو طے ہے کہ دنیا کے جن شعرا اور ادبا نے زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کیا وہ سخت مایوسی اور قنوطیت کا شکار تھے۔ یا پھر یوں کہنا چاہیے کہ انہیں زندگی کا مفہوم ہی سمجھ نہیں آیا۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ زندگی جیسی قیمتی شے سے کون ہاتھ دھونا چاہتا ہے؟ لیکن پھر یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ بعض اوقات مسلسل ناکامیاں، احساس محرومی اور معاشی عوامل انسان کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ فنا کی وادی میں اتر جائے۔ بے شمار لوگ اپنی بیماریوں سے تنگ آ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔ ہم ذیل میں دنیائے ادب کے ان نامور لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں جنہوں نے خودکشی کو زندگی پر ترجیح دی۔



1- سلویا پلیتھ

امریکہ سے تعلق رکھنے والی اس شاعرہ، ناول نگار اور افسانہ نگار سلویا پلیتھ نے بہت نام کمایا۔ وہ 27 اکتوبر 1932 کو بوسٹن میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے کیمرج یونیورسٹی کے سمتھ کالج اور نیو ہیم کالج سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ شاعرہ اور ادیبہ کی حیثیت سے مشہور ہوئیں۔ انہوں نے 1956 میں شاعر ٹیڈ ہیوز سے شادی کی اور وہ امریکہ، انگلینڈ میں رہتے رہے۔ ان کے دو بچے تھے۔ 1962 میں ان میں علیحدگی ہو گئی۔

سلویا بلوفت کے دور سے ہی مایوسی کا شکار تھیں اور ان کا کئی بار علاج کیا گیا۔ سلویا کے مشہور شعری مجموعوں میں ''دی کلوسس اور دوسری نظمیں، ایریل اور ایک ناول ''بیل جار'' شامل ہیں۔ ان کی موت کے بعد انہیں نظموں کے مجموعے پر ''پلٹی زر پرائز'' دیا گیا۔ 11 فروری 1963 کو انہوں نے خودکشی کر لی۔ ان کے ایک دوست نے ان کی موت کے بعد اپنی کتاب میں لکھا کہ سلویا پلیتھ مسلسل مایوسی کا شکار تھیں لیکن اس کی وجوہات جاننے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ اس دوست نے امریکہ کے ادبی حلقوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا۔

2- ولیڈیمیر میاکووسکی

روس سے تعلق رکھنے والے میاکووسکی نے شاعر، ڈرامہ نگار اور اداکار کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کی۔ وہ 1893 میں پیدا ہوئے 1917 کے بالشویک انقلاب سے پہلے ہی وہ مقبول ہو چکے تھے۔ ان کی دو بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ وہ گھر میں روسی زبان بولتے تھے جبکہ دوستوں سے وہ جارجین زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ 1906 میں وہ مارکسی ادب سے متاثر ہوئے۔ ان کی مشہور ترین نظم شاعری سے متعلق گفتگو، اور ڈرامے ''دی ہاتھ بادس اور ''بیڈ بگ'' نے سب کو چونکا کے رکھ دیا، انہوں نے اداکاری کے میدان میں بھی خود کو منوایا۔ ان کی نظم ''اے کلاؤڈ ان ٹراؤزرز'' نے بھی خوب پذیرائی حاصل کی۔ انہوں نے مزاحیہ شاعری بھی کی۔ روس کے نامور ادیب میکسم گورکی نے بہت سارے مواقع پر ان کی بہت مدد کی۔ ان کی دیگر کئی نظموں کو بھی بہت شہرت ملی جن میں ''بیک بون فلوٹ، دی وار اینڈ دی ورلڈ اور دی مین'' شامل ہیں۔

اپنی خودنوشت ''میں بذات خود'' میں انہوں نے لکھا ہے کہ جب میں نے لینن کو پہلی بار دیکھا تو یہ سوال ہی نہیں اٹھا کہ میں انہیں قبول کروں یا نہ کروں۔ ان کا لایا ہوا انقلاب میرا انقلاب تھا''۔ 12 اپریل 1930 کو میاکووسکی نے خود کو گولی مار کر خودکشی کر لی۔ ان کی موت کے بعد روس کے وزیراعظم جوزف سٹالن نے کہا ''میاکووسکی ہمارے عہد کا بہترین اور ذہین ترین شاعر تھا''۔

3- ارنسٹ ہیمنگوے

اس امریکی ناول نگار، صحافی اور افسانہ نگار کو بھی اپنی زندگی میں ہی زبردست شہرت ملی۔ 21 جولائی 1899 کو امریکہ میں پیدا ہونے والے ارنسٹ ہیمنگوے نے اسلوب نگارش نے بیسویں صدی کے ادب پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ہیمنگوے نے زیادہ تر کام 1920 اور 1950 کے درمیان کیا۔ 1954 میں انہیں ادب کا نوبیل پرائز ملا۔ ان کے سات ناول اور افسانوں کے چھ مجموعے شائع ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انہوں نے جو ناول لکھا وہ اسی جنگ اور اس کے اثرات کے حوالے سے تھا جس کا عنوان تھا ''اے فیرویل ٹو آرمز''۔ ان کا سب سے پہلا ناول ''دی سن آلسو رائزز'' 1926 میں شائع ہوا۔ انہوں نے اپنا شہرہ آفاق ناول ''فار ہوم دی بیل ٹالز'' 1940 میں شائع ہوا۔ یہ سپین کی خانہ جنگی کے حوالے سے تھا۔ اس ناول پر فلم بھی بنی اور اس فلم نے بھی بے پناہ شہرت حاصل کی۔ ان کا ناول ''دی اولڈ مین اینڈ دی سی'' جو 1952 میں شائع ہوا۔ انہوں نے چار شادیاں کیں۔ خودکشی سے پہلے وہ شدید بیمار ہو گئے تھے اور یہ افواہ پھیل گئی کہ وہ قریب المرگ ہیں۔ لیکن یہ افواہ غلط ثابت ہوئی۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ بیماریوں نے ان کی جان نہیں چھوڑی۔ اور یہ انہی بیماریوں کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے دو جولائی 1961 کو خود کو گولی مار کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

4- ورجینیا ولف

ورجینیا ولف کا تعلق انگلینڈ سے تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کی ادیبہ تھیں۔ ان کا شمار بیسویں صدی کے ان اہم ترین ادیبوں میں ہوتا تھا جنہوں نے جدید اسلوب میں لکھا۔ ورجینیا ولف کا تعلق لندن ایک متمول گھرانے سے تھا۔ وہ آٹھ بہن بھائی تھے اور ان کا نمبر ساتواں تھا۔ 25 جنوری 1882 کو پیدا ہونے والی ورجینیا وولف نے سب سے پہلے 1927 میں ناول لکھا جس کا نام تھا ''تو دی لائٹ ہاؤس'' 1895 کو ان کی والدہ چل بسیں اور انہیں ذہنی طور پر شدید دھچکا لگا۔ دو سال بعد ان کی سوتیلی بہن کا بھی انتقال ہو گیا جس سے ان کی بہت زیادہ وابستگی تھی۔ 1900 میں ورجینیا وولف نے ادب کو پیشے کے طور پر اپنا لیا۔

1905 میں ورجینیا ولف کے والد کا انتقال ہوا تو ایک دفعہ انہیں پھر شدید صدمہ پہنچا۔ اس کے بعد یہ خاندان کنگسٹن چھوڑ گیا۔ اور بلومزبری میں رہائش پذیر ہو گیا۔ یہاں ورجینیا ولف نے اپنے بھائی کے دانشور دوستوں سے مل کر ادبی گروپ قائم کیا۔ 1915 میں ان کا پہلا ناول ''دی ووئج آؤٹ'' شائع ہوا۔ یہ ناول ان کے سوتیلے بھائی کے اشاعتی ادارے نے شائع کیا۔ اس کے بعد ان کے ناول مسز ڈیلوے (1925)، ٹو دی لائٹ ہاؤس (1927) اور یا مُنڈو (1928) شائع ہوئے۔

ورجینیا ولف اپنے مضامین کی وجہ سے بھی بہت مقبول ہوئیں خاص طور پر 1929 میں شائع ہونے والے ان کے مضمون ''اے روم آف ون'' اون'' بہت پسند کیا گیا۔ اس میں انہوں نے ایک فقرہ ایسا لکھا جس کا حوالہ بہت زیادہ دیا جاتا ہے۔ وہ یہ تھا ''اگر کوئی عورت افسانہ نگاری کرنا چاہتی ہے تو اس کے پاس پیسہ بھی ہونا چاہیے اور اس کا اپنا ایک کمرہ بھی ہونا چاہیے''۔

ورجینیا وولف نے 1912 میں لیونارڈ وولف سے شادی کی۔ انہوں نے دو بار خودکشی کی ناکام کوشش کی۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ورجینیا وولف تمام عمر ذہنی بیماریوں کا شکار رہیں۔ 1941 میں انہوں نے دریا میں کود کر خودکشی کر لی۔

5- یوکیو میشیما

یہ جاپانی ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار، اداکار اور فلمی ہدایت کار تھے۔ یوکیو میشیما کو بیسویں صدی کے بہترین جاپانی ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ 1968 میں ادب کے نوبیل انعام کیلئے زیر غور تھا لیکن پھر یہ انعام انہی کے ہم وطن یاسوناری کاوابتا کو دے دیا گیا۔

ان کے ناولوں میں ''کنفیشنز آف دی ماسک''، ٹمپل آف دی گولڈن پیویلین اور مضمون ''سن اینڈ سٹیل'' شامل ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے پاس الفاظ کا بہت ذخیرہ تھا اور اس کے علاوہ وہ بڑے دلکش استعارے استعمال کرتے تھے۔

14 جنوری 1925 کو ٹوکیو میں پیدا ہونے والے میشیما بڑے زبردست قوم پرست تھے۔ انہوں نے ایک غیر مسلح شہریوں کی فوج بنائی جس کا مقصد یہ تھا کہ جاپانی شہنشاہ کے اختیارات بحال کیے جائیں۔ 25 نومبر 1970 کو میشیما اور ان کی فوج کے چار ارکان وسطی ٹوکیو کے ایک فوجی اڈے میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے کمانڈنٹ کو یرغمال بنا لیا اور جاپان کی اپنا تحفظ کرنے والی فوجوں کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ جاپان کا 1947 کا آئین تہ و بالا کر دیں۔ جب ان کی یہ کوشش ناکام ہو گئی تو میشیما نے خودکشی کر لی۔

اب ذیل میں ہم ان پاکستانی شاعروں اور ادیبوں کا بھی ذکر کریں گے جنہوں نے خودکشی کا راستا اپنایا۔

1- شمس آغا

شمس آغا اگرچہ اتنے معروف نہیں ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک ذہین ناول نگار اور افسانہ نگار تھے۔ وہ 1922 میں آگرہ میں پیدا ہوئے، بچپن سے ہی بڑے حساس تھے۔ والدین کی علیحدگی کے بعد وہ اپنی والدہ اور بہن بھائیوں سے جدا ہو گئے۔ اس سے ان کی ذہنی کوفت اور بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ 3 دسمبر 1945 کو وہ اچانک غائب ہو گئے اور پھر کبھی گھر نہیں آئے ان کے قریبی رشتے دار وزیر آغا کا کہنا تھا کہ شمس آغا نے خودکشی کر لی۔ اس سے پہلے وزیر آغا ان کی جان بچا چکے تھے جب شمس آغا نے نشہ آور ادویات کھائی تھیں۔ شمس آغا نے 9 افسانے اور ایک نامکمل ناول لکھا۔

2- شکیب جلالی

وہ ایک لاجواب شاعر تھے۔ آج ان کا شمار ملک کے ان بہترین شعرا میں ہوتا ہے جو آزادی کے بعد منظر عام پر آئے۔ شکیب جلالی کو زیادہ تر ان کے ہم عصروں نے نظر انداز کیا۔ ان کا اصل نام سید حسن رضوی تھا۔ وہ علی گڑھ کے قریب ایک گاؤں جلال میں یکم اکتوبر 1934 کو پیدا ہوئے۔ والدہ کی وفات نے انہیں شدید صدمہ پہنچایا۔ ان کے والد ذہنی بیماریوں کا شکار تھے جس نے شکیب کی والدہ کو جلتی ترین کے آگے پھینک دیا تھا اور شکیب نے اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ واقعہ تمام عمران کے ذہن پر چھایا رہا۔ اور پھر 12 نومبر 1966 کو شکیب جلالی نے بھی سرگودھا کے قریب چلتی ترین کے آگے کود کر خودکشی کر لی۔ ان کی شعری مجموعہ ''روشنی اے روشنی'' 1972 میں شائع ہوا۔

3- سارا شگفتہ

31 اکتوبر 1954 کو گوجرانوالہ میں پیدا ہونے والی اس شاعرہ نے اپنی منفرد شاعری سے بے شمار لوگوں کو متاثر کیا۔ انہوں نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ وہ ایک پراسرار شخصیت کی مالک تھیں، ان کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا۔ وہ تعلیم کے ذریعے سماج میں مقام حاصل کرنے کی آرزومند تھیں لیکن شومئی قسمت کہ وہ میٹرک کا امتحان پاس نہ کر سکیں، ان کی سوتیلی ماں، جلد شادی اور پھر بعد میں تین اور شادیوں نے سارا شگفتہ کے دکھوں میں اضافہ کیا۔ انہوں نے خودکشی کرنے کی ناکام کوشش کی لیکن پھر 4 جون 1984 کو انہوں نے بھی کراچی میں اپنے آپ کو ایک چلتی ٹرین کے آگے پھینک دیا اور زندگی کی قید سے آزاد ہو گئیں۔

4- ثروت حسین

اُردو اور پنجابی کے معروف شاعر ثروت حسین 9 نومبر 1949 کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ثروت کو کراچی کے ایک کالج میں لیکچرر کی نوکری مل گئی۔ جب لاڑکانہ کے قریب ایک قصبے کے کالج میں ان کا تبادلہ کر دیا گیا تو وہ شدید تنہائی کا شکار ہو گئے۔ ایک شاعرہ کی محبت میں گرفتار ثروت حسین کے لیے زندگی بہت مشکل ہو گئی۔ وہ شاعر ان کو مسلسل نظر انداز کرتی رہی، جب ان کا تبادلہ حیدرآباد کر دیا گیا تو وہ نفسیاتی عوارض کا شکار ہو چکے تھے۔ انہوں نے بھی چلتی ٹرین کے آگے کود کر زندگی سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ ان کی جان بچا لی گئی لیکن وہ ٹانگوں سے معذور ہو گئے۔ 9 ستمبر 1996 کو انہوں نے پھر کراچی میں چلتی ٹرین کے آگے خود کو گرا لیا اور راہی ملک عدم ہو گئے۔

4- مصطفیٰ زیدی

ان کی شاعری کے بارے میں کیا کہا جائے؟ ایک باکمال اور خوبصورت شاعر جس طرح موت کی وادی میں جا پہنچا، وہ بہت المناک ہے وہ ایک اعلیٰ سرکاری افسر تھے۔ 10 اکتوبر 1930 کو الہ آباد (بھارت) میں پیدا ہونے والے مصطفیٰ زیدی 12 اکتوبر 1970 کو کراچی میں پراسرار حالات میں مردہ پائے گئے۔ کچھ کا کہنا ہے انہیں قتل کیا گیا زیادہ تر لوگ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے خودکشی کی۔







روزنامہ جنگ لاہور 24 جنوری 2018ء

جھڑی اور رم جھم کا مہینہ ماگھ، جب گندم سبز چولے پہنتی ہے

سردی جوبن دکھا کر واپسی کا سفر شروع کرتی ہے اور دن لمبے ہونے لگتے ہیں

کاموسمی (نامہ نگار) جھڑی اور رم جھم کا مہینہ ماگھ، جب گندم کی فصل سبز چولے پہنتی ہے اور سرسوں کے پیلے پھول اپنے عروج پر ہوتے ہیں۔ جب سردی اپنا جوبن دکھا کر واپسی کا سفر شروع کرتی ہے، مویشیوں کا دُودھ بڑھ جاتا ہے اور دن لمبے ہونے لگتے ہیں، ٹھنڈی کے سردار مہینوں میں پہلا نمبر پوہ دوسرا ماگھ کا آتا ہے پوہ میں سردی شدید اور خشک ہوتی ہے۔ جبکہ ماگھ میں سردی ٹھنڈی ہواؤں، دُھند اور بارش سے ہوتی ہے۔ اس مہینہ میں اکثر سبزیوں گوبھی، مولی اور شلجم وغیرہ کی نشوونما رُک جاتی ہے۔ مٹر کی فصل اسی مہینہ میں بھرپور پھل دیکر ختم ہونے لگتی ہے۔ جبکہ سرسوں کو پڑنے پیلے پھول اس مہینہ کے ابتدائی دس دنوں میں بھرپور بہار دکھاتے ہیں۔ اس کے بعد ان میں بیج پڑنے لگتے ہیں، سرسوں کے پیلے پھول جب تیز دھوپ میں ٹھنڈی ہواؤں کے سنگ جھومتے تو پس منظر میں سرسوں کے سر

صفحہ 4 بقیہ نمبر 1

بقیہ 1

ماگھ

سبز کھیت عجیب نظارہ دیتے ہیں۔ اسی موسم میں بسنت کا میلہ منانے کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ دیہاتوں میں دوشیزائیں پیلے دوپٹے اوڑھتیں اور گھبرو جوان پیلی پگڑیاں اور پیلے پٹکے گلے میں ڈالتے جبکہ شہروں میں لڑکیاں پیلے ڈوپٹے اور پیلے پھولوں والی قمیضیں پہنتی اور نوجوان پیلے پٹکے گلے میں ڈالتے اور پیلی شرٹیں پہنتے اور پہلوان سُرخ دھاری دار لاچوں کے ساتھ سلک کی پیلی قمیضیں اور پیلی پگڑیاں پہنتے، گاجر گینو اور مؤسمی اسی مہینہ میں میٹھے ہوتے ہیں اس مہینہ میں اگر دھوپ لگے تو خوشگواریت اور ماں کی گود کی طرح نرمی اور گرمی سے بھری ہوتی ہیں۔ ماگھ اگرچہ رم جھم اور جھڑیوں کا مہینہ کہا جاتا ہے۔ لیکن آلودگی اور دُنیا کے بدلتے موسموں نے اسکا مزاج بدل دیا ہے۔ اور اب اکثر یہ خشک یا ایک آدھ بارش برسا کر گزر جاتا ہے۔ لیکن پہلے ماگھ کے موسم میں جھڑی لگتی، تو پھر کچے صحنوں میں بے آواز بارش برستی ہی جاتی اور ہفتہ ہفتہ بھر سورج نظر نہ آتا اور بارش کی پھوار دن رات جاری رہتی، گھروں میں اُپلے اور دیگر ایندھن خشک لکڑی وغیرہ ختم ہوتی جاتی۔ کھلے صحنوں میں بنے مٹی کے چولہے گیلے ہوجاتے اور کھانا پکانا مشکل ہوجاتا دوسری طرف بریسم کی فصل میں پانی کھڑا ہوجاتا۔ اور مویشیوں کیلئے چارہ کاٹنا بھی مشکل ہوجاتا کبھی کبھی شام کو مغرب سے سورج بادلوں کی اُوٹ سے اپنا دیدار کروا دیتا تو گھونسلوں میں بیٹھے پرندے بھی رزق کی تلاش میں نکل آتے اور دیکھتے ہی دیکھتے پھر بادل چھا جاتے، بارشوں کے بعد موسم صاف ہوتا دُھند چھا جاتی اور صبح کے وقت دُھند اور سورج کی جنگ دیدنی ہوتی۔ کبھی سورج جیت جاتا تو دن روشن اور کبھی دُھند کو کامیابی ملتی تو دن رات کا منظر پیش کرتا، جھڑی کے موسم میں گھروں سے نکلنا مشکل اور خوراک خریدنے بازار جانا ممکن نہ ہوتا تو گھروں میں خشک کی گئی سبزیاں پانی میں بھگو کر رکھی جاتیں اور نرم ہونے پر انہیں پکایا جاتا، تاہم ان مشکلات کے باوجود رم جھم کو خوب جوش وخروش سے منایا جاتا، خاص طور پر بچوں کیلئے یہ موسم بڑا پُرکشش ہوتا کہ دن کو بھی گرم رضائی اور کوئلوں کی آگ کے پاس بیٹھ کر دادی اماں سے کہانیاں سُننے کو ملتیں گُڑ کی گچک، گڑ والے چاول، باداموں اور گریوں والی پنیاں اور پنجیریاں بھی بچوں کو کھلائی جاتیں، بزرگ اس مہینہ میں پھکڑا، السی، سوجی، ماش اور دیگر چیزوں سے اعصاب کو طاقت دینیت والی چیزیں دیسی گھی میں تیار کر کے کھاتے تاکہ اگلے موسموں تک اپنے آپ کو قائم رکھ سکیں، ماگھ کے مہینہ کے آخر میں موسم بسنتی ہونے لگتا، ہوائیں ٹھنڈی دھوپ گرم اور سبز کھیت عجیب نظارہ پیش کرتے اور موسم کے ساتھ طبیعت بھی بسنتی ہونے لگتی لیکن نئی نسلوں میں تو شاید اس مہینہ کی رومانویت کو محسوس کرنے کی حس بھی نہیں رہی اور اُمراء دولت کے چکر میں نہ برستی برسات کو نظر بھر کر دیکھتے ہیں اور نہ ہی دکتی دھوپ میں بیٹھنے کا اُنکے پاس وقت ہوتا ہے جلتے ہیٹر اور بند کمرے ہی اُن کی کُل کائنات ہیں۔

چیت، جب چند جھونکے اور ایک بارش موسم بدل دیتی ہے

کبھی کبھار بارش برس بھی جاتی ہیں، مچھر کی نسل بھی اسی مہینہ میں بڑھتی ہے

کاموسمی (نامہ نگار) چیت کا مہینہ، جب ہوا کے چند جھونکے اور ایک بارش موسم بدل دیتی ہے، روشن آسمان پر کالی گھٹائیں جھوم کے آتی ہیں اور کبھی کبھار برس بھی جاتی ہیں، ژالہ باری بھی ہوسکتی ہے اور بادل بن برسے بھی گذر جاتے ہیں۔ بریسم کی فصل پھولوں پر آجاتی ہے اور اُسکی خوشبو ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ مچھر کی نسل بھی اسی مہینہ میں بڑھتی ہے۔ گُلِ نشتر اور سنبل کے درخت بھی اسی مہینہ میں پھولوں کا سرخ لباس پہن لیتے ہیں، چیت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اگلے مہینہ میں گندم کی فصل پکنے کی نوید لیکر آتا ہے اور چنے کی فصل بھی اسی مہینے میں تیار ہوتی ہے، موسم بہار میں پھوٹنے والی کونپلیں بھی اسی مہینہ میں جوان ہوتی ہیں، پھاگن کا مہینہ اگر چہ خوشگواریت اور بارشوں کی وجہ سے مشہور ہے اور اُسکے مزاج سے یکسر مختلف مہینہ چیت کا ہے۔ اس سلسلہ میں پنجابی اکھان بھی مشہور ہے کہ "چیت کرے چترائیاں پھاگن جھڑیاں لایاں" (یعنی چیت کا مہینہ چالاک اور دھوکے باز اور متلون مزاج ہے جبکہ پھاگن میں جھڑی لگتی ہے) چیت کے مہینے میں اکثر کالی گھٹائیں جھوم کے آتی ہیں لیکن بن برسے گذر جاتی ہیں اور گرمی کی شدت ٹوٹ جاتی ہے۔ باریک کپڑے پہننے لوگ ایک دو جھونکوں اور کالی گھٹاؤں کی آمد پر گرم کپڑے دوبارہ پہننے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ اس مہینہ میں آنے والے بادل بھی کبھار برس بھی جاتے ہیں۔ جل تھل بھی ہوسکتی ہے۔ اور اولے بھی پڑسکتے ہیں۔ موسموں کی تبدیلی، پھولوں کے پکنے بنی کونپلوں کے جوان ہونے اور نوخیز کلیوں کو پھول بنانے میں اسی مہینہ کی گرمی کا اہم کردار ہوتا ہے۔ بریسم کی فصل جو پھاگن میں تیزی سے بڑھتی ہے اور کئی کئی بار کاٹی بھی جاتی ہے۔ چیت میں گرمی کی وجہ سے بڑھنے سے رُک جاتی ہے اور چیت کے آخر میں اسے پھول لگ جاتے ہیں جن کی بھینی بھینی خوشبو ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ نیم، شیشم اور دھریک کو پھول بھی اسی مہینہ میں لگتے ہیں جن کی بھینی بھینی مہک شام کو نہایت رومانوی بنادیتی ہے۔ گُلِ نشتر کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور سرخ پھولوں سے درخت اس حد تک لد جاتے ہیں کہ دور سے لگتا ہے کہ کہیں آگ بھڑک رہی ہے۔ غرض یہ متلون مزاج مہینہ فصلوں کے پکنے، گرمی کی آمد اور گندم کی فصل کے پکنے میں بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔ اس مہینے میں اگر موسم خوشگوار رہے اور ایک دو بارشیں ہوں تو گندم کی فصل کا دانہ موٹا اور صحت مند ہوجاتا ہے اور پیداوار خوب ہوتی ہے اور اگر گرمی کی شدت بڑھ جائے اور بارشیں نہ ہوں تو گندم کی پیداوار کم ہوجاتی ہے۔ درختوں پر لگی کونپلوں کو پتے کی شکل اختیار کرنے اور پتوں سے پھول اور پھول سے بیج تک کا سفر بھی اسی مہینہ میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ چیت کی شامیں سہانی اور راتیں خنک ہوتی ہیں۔

روزنامہ جنگ لاہور (6) 18 مارچ 2018ء

CamScanner

چیت، ہوا کے چند جھونکے اور ایک بارش موسم بدل دیتی ہے

روشن آسمان پر کالی گھٹائیں خمسوم کے آتی ہیں اور کبھی کبھار برس بھی جاتی ہیں

کاموکی (نامہ نگار) چیت کا مہینہ جب ہوا کے چند جھونکے اور ایک بارش موسم بدل دیتی ہے، روشن آسمان پر کالی گھٹائیں خمسوم کے آتی ہیں اور کبھی کبھار برس بھی جاتی ہیں ژالہ باری بھی ہوسکتی ہے اور بادل بن برسے بھی گذر جاتے ہیں۔ برسیم کی فصل پھولوں پر آجاتی ہے اور اسکی خوشبو ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ مچھر کی نسل بھی اسی مہینہ میں بڑھتی ہے۔ گل نشتر اور سنبل کے درخت بھی اسی مہینہ میں بھی پھولوں کا سرخ لباس پہن لیتے ہیں چیت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اگلے مہینہ میں گندم کی فصل پکنے کی نوید لیکر آتا ہے اور چنے کی فصل بھی اسی مہینے میں تیار ہوتی ہے موسم بہار میں پھوٹنے والی کونپلیں بھی اسی مہینہ میں جوان ہوتی ہیں پھاگن کا مہینہ اگرچہ خوشگواریت اور بارشوں کی وجہ سے مشہور ہے اور اسکے مزاج سے یکسر مختلف مہینہ چیت کا ہے۔ اس سلسلہ میں پنجابی اکھان بھی مشہور ہے کہ " چیت کرے چترائیاں پھاگن جھڑیاں لایاں" (یعنی چیت کا مہینہ چالاک اور دھوکے باز اور متلون مزاج ہے جبکہ پھاگن میں جھڑی لگتی ہے) چیت کے مہینے میں اکثر کالی گھٹائیں جھوم کے آتی ہیں لیکن بن برسے گذر جاتی ہیں اور گرمی کی شدت ٹوٹ جاتی ہے۔ باریک کپڑے پہننے لوگ ایک دو جھونکوں اور کالی گھٹاؤں کی آمد پر گرم کپڑے دوبارہ پہننے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ اس مہینہ میں آنے والے بادل کبھی کبھار برس بھی جاتے ہیں۔ جل تھل بھی ہوسکتی ہے۔ اور اولے بھی پڑسکتے ہیں۔ موسموں کی تبدیلی، پھولوں کے پکنے، نئی کونپلوں کے جوان ہونے اور نوخیز کلیوں کو پھول بنانے میں اسی مہینہ کی گرمی کا اہم کردار ہوتا ہے۔ برسیم کی فصل جو پھاگن میں تیزی سے بڑھتی ہے اور کئی کئی بار کاٹی بھی جاتی ہے۔ چیت میں گرمی کی وجہ سے بڑھنے سے رُک جاتی ہے اور چیت کے آخر میں اسے پھول لگ جاتے ہیں جن کی بھینی بھینی خوشبو ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ نیم، شیشم اور دھریک کو پھول بھی اسی مہینہ میں لگتے ہیں جن کی بھینی بھینی مہک شام کو نہایت رومانوی بنادیتی ہے۔ گل نشتر کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور سرخ پھولوں سے درخت اس حد تک لد جاتے ہیں کہ دور سے لگتا ہے کہ کہیں آگ بھڑک رہی ہے۔ غرض یہ متلون مزاج مہینہ فصلوں کے پکنے، گرمی کی آمد اور گندم کی فصل کے پکنے میں بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔ اس مہینے میں اگر موسم خوشگوار رہے اور ایک دو بارشیں ہوں تو گندم کی فصل کا دانہ موٹا اور صحت مند ہوجاتا ہے اور پیداوار خوب ہوتی ہے اور اگر گرمی کی شدت بڑھ جائے اور بارشیں نہ ہوں تو گندم کی پیداوار کم ہوجاتی ہے۔ درختوں پر گلی کونپلوں کو پتے کی شکل اختیار کرنے اور پتوں سے پھول اور پھول سے بیج تک کا سفر بھی اسی مہینہ میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ چیت کی شامیں سہانی اور راتیں خنک ہوتی ہیں۔

روزنامہ جنگ لاہور 18 مارچ 2017ء

روزنامہ جنگ لاہور (6) 20 اپریل 2018ء

★★★★★

گندم پک جائے اور کھیت سنہری ہوجائیں تو سمجھ لیں بیساکھ آگیا

ٹھنڈی اشیاء کھانے کو جی چاہتا ہے، شامیں سہانی اور راتیں خنک ہوجاتی ہیں

کاموکی (نامہ نگار) جب گندم پک جائے اور کھیت سنہری ہوجائیں جب برسیم کو پھول لگ جائیں، جب کاشتکار ساون کی بارش سے بھی ڈرنے لگے، جب امبیاں پک جائیں اور درختوں پر لگے پھول پھلوں کی شکل اختیار کرنے لگیں، جب کاشتکار کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھرنے لگیں، تو سمجھ لیں کہ یہ گرمیوں کے آغاز کا پہلا مہینہ بیساکھ ہے جو کاشتکاروں کیلئے خوشی کی خبریں لیکر آتا ہے۔ چیت کے اختتام کے بعد شروع ہونے والے اس مہینہ میں گندم کی فصل پک کر سونے رنگ کا لباس اوڑھ لیتی ہے اور گندم کے سنہری سٹے کاشتکار کے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کی نوید دیتے رہتے ہیں دور سے گندم کے کھیت سونے سے بھرے میدان نظر آتے ہیں۔ سبزہ اپنا رنگ بدلنے لگتا ہے گرمی اور دھوپ کی تمازت سے دن گرم ہوجاتے ہیں پسینہ آنے لگتا ہے اور ٹھنڈی اشیاء کھانے کو جی چاہتا ہے تاہم شامیں سہانی اور راتیں خنک ہوتی ہیں اور رات کو چھتوں پر لیٹے کاشتکار اور اُنکے خاندان چاندنی راتوں میں اپنے سنہری کھیتوں میں لہلہاتی فصل کو دیکھ کر آنے والے سنہری دنوں کے خواب دیکھتے سوجاتے ہیں اور خنک اور رومانوی راتوں کو چھت پر لیٹی ماں بچوں کو چاند پر چرخہ کاتنے والی بی اماں کی کہانی سناتی ہے اور جب خنکی کی وجہ سے چہروں پر کپاس کے نئے سفید کھیس اوڑھے جاتے ہیں تو کھیس کی باریک درزوں سے چاندنی ستاتی ہے اور چاند مجبور کرتا ہے کہ کھیس اُتار کر میری چاندنی سے لطف اندوز ہوں بیساکھ کی یکم تاریخ کو میلہ بیساکھ شروع ہوتا ہے اور بیساکھ کی یکم تاریخ کو ہی لوگ راجباہوں اور نہروں میں غسل کرتے ہیں کہ اُن کا عقیدہ ہے کہ یکم بیساکھ کو چلتے پانی میں نہانے سے سارا سال چھنسی پھوڑے نہیں نکلتے۔

جیٹھ میں کسان فصلوں کی کٹائی سے فارغ، دن لمبے راتیں چھوٹی ہوتی ہیں

دیہاتی زیادہ تر دوپہر کا وقت گھروں میں گزارتے، ستو، گڑ کا شربت اور لسی پیتے ہیں

وزیرآباد (نامہ نگار) جیٹھ دیسی (بکرمی) سال کا تیسرا مہینہ ہے۔ کسان اس مہینہ میں ربیع کی فصلوں کی کٹائی سے فارغ ہوجاتے ہیں جبکہ دھان کی کاشت کی تیاریاں اور پنیری کی بجائی کردی جاتی ہے۔ گرمی بھرپور جوبن پر اسی ماہ میں گرم لو چلتی ہے جس سے کھیتی اور مچھر ہلاک ہوجاتے ہیں پنجابی کا مشہور مقولہ ہے (جیٹھ ہاڑ مچھیں ساون بھادوں رکھیں) یعنی جیٹھ اور ہاڑ کے مہینوں میں بند کمروں اور گھروں میں آرام کیا جائے اور ساون بھادوں میں درختوں کے دوپہر گزاری جائے۔ جیٹھ بکرمی سن کا تیسرا مہینہ ہے جس کی ابتدا انگریزی مہینہ مئی کی 15 تاریخ سے ہوتی ہے جبکہ 15 جون اختتام ہوتا ہے۔ 31 روز پر مشتمل دیسی مہینہ جیٹھ کے دن سب سے لمبے اور راتیں سب سے چھوٹی ہوتی ہیں آج بھی دیہاتوں میں بسنے والے متعدد افراد دیسی (بکرمی) مہینوں کے مطابق اپنے پروگرام مرتب کرتے ہیں۔ نانک شاہی کیلنڈر میں بھی اس مہینہ کو خاص اہمیت حاصل ہے سکھوں کے گرو امرداس جی اسی مہینہ کی 9 تاریخ کو پیدا ہوئے۔ جیٹھ اور ہاڑ میں گرمی کی شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے دیہات میں لوگ زیادہ تر دوپہر کا وقت گھروں میں گزارتے ہیں مشروبات میں ستو، گڑ کا شربت اور چائی کی لسی کا استعمال عام کیا جاتا ہے دوپہر کے کھانے کا خاص اہتمام تندوری کی روٹی، دھنیا پودینہ کی چٹنی اور کچے گھڑے کا پانی دیہات کی پرانی روایت ہے۔ ملیریا اس مہینے کا خطرناک مرض تصور کیا جاتا ہے جس کا علاج آج بھی دیہات میں گلو اور اجوائن کی سردائی سے کیا جاتا ہے قدیم پنجابی مقولہ ہے سخت گرمی اور لو سے اس ماہ میں مویشیوں اور آک کے پودے سے دودھ خشک ہوجاتا ہے گھاس اور سبزہ کی بھی قلت پیدا ہوجاتی ہے جانوروں کو چارے کے طور پر بھوسہ اور کھل چوکر استعمال کروایا جاتا ہے مکئی باجرہ اور جوار کی کاشت جیٹھ کے مہینے میں کاشت کی جاتی ہے جو ایک ماہ میں کٹائی کے قابل ہوجاتی ہیں ان فصلوں کا دورانیہ 90 روز کا ہوتا ہے۔ دیہات کے چھوٹے بڑے بھی افراد سر پر پگڑی اوڑھنیاں سجا لیتے ہیں سوتی کپڑے، دھوتی، تہہ بند پہنتے ہیں خربوزہ، تربوز جیٹھ کے سب سے مشہور پھل ہیں جنہیں آج بھی دیہاتی بطور سوغات اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو بھیجتے ہیں۔

روزنامہ جنگ لاہور (4) 15 مئی 2017ء

کامونکی، ہاڑ کے مہینہ کا آخری تحفہ پُرے کی ہوائیں چلنا شروع

ہوائیں بارش کا پیغام لیکر آتی ہیں، بارش سے پہلے شدید حبس اور گرمی کا باعث بنتی ہیں

کامونکی (نامہ نگار) ہاڑ کے مہینہ کا آخری تحفہ پُرے کی ہوائیں چلنا شروع، پُرے کی ہوا بارش کا پیغام لیکر آتی ہیں، بارش سے پہلے شدید حبس اور گرمی کا باعث بنتی ہیں مہینہ کے وسط میں پُرے کی ہوائیں چلنا شروع ہوتی ہیں، جو مشرق سے چلتی ہیں، اور اُنکا رُخ مغرب کی طرف ہوتا ہے، یہ تیز ہوائیں گرم اور مرطوب ہوتی ہیں، اگرچہ جسم کو ہوا لگ رہی ہوتی ہے لیکن پسینہ خشک نہیں ہوتا، اور جسم کا جو حصہ ہوا کے سامنے ہوتا ہے، اُسکے کچھ ہوا لگتی ہے، دوسرے حصے پسینہ سے شرابور ہوتے ہیں، ہاڑ کے مہینہ میں چلنے والی ہوائیں اگرچہ شدید پریشانی کا باعث بنتی ہیں، ان ہواوں سے کھیتوں میں لگی سبزیاں خراب ہوجاتی ہیں اور ان میں کیڑے پڑ جاتے اور دیگر پودے میں خراب ہوجاتے ہیں، یہ ہوائیں اصل میں بارشوں کی آمد کی نوید ہوتی ہیں، 24 گھنٹے سے 72 گھنٹے تک پُرے کی ہوا چلنے کے بعد بارش آجاتی ہے، ان ہواؤں کے رُخ بدل جاتے ہیں، یہ مزاج بھی بدل لیتی ہیں اور ٹھنڈے جھونکوں میں انکی اچانک تبدیلی سے ماحول خوشگوار ہوجاتا ہے اور بارش سے رُوح اور جسم پر جمی گرد اور تیل بھرا پسینہ اُترنے لگتا ہے۔

ہفتہ 13 شوال المکرم 1438ھ 8 جولائی 2017ء 24 ہاڑ 2074ب

گرمی کا سردار مہینہ جیٹھ، جب ستو اور شکر کا شربت پیا جاتا ہے

دوپہر کچے اور پچھلے کمروں میں گذاری جاتیں، خربوزے اور تربوز کا استعمال کیا جاتا ہے

کامونکی (نامہ نگار) گرمی کا سردار مہینہ جیٹھ، جب لو چلتی ہے جب ستو اور شکر کا شربت پیا جاتا اور دوپہر کچے اور پچھلے کمروں میں گذاری جاتیں جب مرد و خواتین بلا امتیاز سر اور پاؤں میں مہندی لگاتے ہیں جب خربوزے اور تربوز کا استعمال کیا جاتا ہے جب دوپہر کو پودینے کی چٹنی اور پیاز، کھیرا اور ککڑی کے سلاد کا استعمال کیا جاتا ہے گرمی کی شدت کے مہینوں میں جیٹھ اور ہاڑ گنے جاتے ہیں۔ جیٹھ کے مہینہ میں گندم کی کٹائی مکمل ہوتی ہے اور کاشتکار دھان کی پنیری کی کاشت سے پہلے چند دن فراغت کے گذارتے ہیں گندم کی فصل کے ساتھ ہی جو کی فصل بھی تیار ہو جاتی ہے اور دیہات میں اُس سے ستو تیار کئے جاتے ہیں جو شکر کے شربت میں ملا کر پیئے جاتے ہیں جو گرمی اور لو سے ہونے والے سائیڈ افیکٹس کو دور کرتے ہیں۔ ستو کا استعمال جہاں کولیسٹرول کی مقدار کو خون سے کم کرتا ہے اور خون کی شریانیں کھولتا ہے۔ وہاں جسم میں ٹھنڈے اور فرحت کا احساس بھی پیدا کرتا ہے دوپہر کے وقت دیہاتوں میں لوگ اپنے گھروں کے پچھلے کمروں میں بیٹھ کر پودینے کی چٹنی اور پیاز کے ساتھ روٹی کھاتے اور کبھی خربوزے کے ساتھ، دیسی گھی سے چوپڑی روٹیاں کھائی جاتیں دوپہر کو قیلولہ کرنا دیہات کی روائت تھی سہ پہر کو ستو شکر کے شربت میں ملا کر پیئے جاتے اور اس سلسلہ میں پنجابی میں محاورہ بھی مشہور ہے" جیٹھ ہاڑ گوٹھیں ساون بھادوں رُکھیں" یعنی (جیٹھ اور ہاڑ کے مہینوں میں کونوں کھدروں میں بیٹھنا چاہیے اور ساون بھادوں کے مہینوں میں درختوں کے نیچے بیٹھنا چاہیے) دوپہر کے وقت گرمی کی شدت کم کرنے کیلئے مرد و خواتین بلا امتیاز مہندی گھول کر پاؤں اور سر میں لگاتے۔ اسے جسم میں ٹھنڈک پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا جب بجلی نہیں ہوتی تھی تو اُس وقت بھی اُمرا اپنی الگ حیثیت برقرار رکھنے میں کامیاب تھے۔ اور وہ اپنے بڑے بڑے کمروں میں خس کی بڑی بڑی ٹٹیاں لگواتے جن پر ملازم دوپہر کو پانی پھینکتے اور اُن خسوں سے لو گذر کر ٹھنڈی ہو جاتی آج کے ائیر کولر اور ڈیزرٹ کولر اُسی بنیادی آئیڈیا سے بنائے گئے ہیں۔

گرمیوں میں ساون بارشوں کے حوالے سے رومانوی مہینہ

جب بارش کے بعد قوس قزح نمودار ہو اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آئے

کاسوکی (نامہ نگار) جب گھنگھور گھٹائیں جھوم کے اٹھیں اور پل بھر میں جل تھل ہو جائے، جب بارش کے بعد قوس قزح نمودار ہو، جب ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آئے، جب کھٹی میٹھی اور چٹ پٹی چیزیں من کو بھانے لگیں اور ہر گھر سے پوڑے تلنے کی کڑکڑاہٹ سنائی دے، جب بارش کے بعد سکھیاں باغوں میں پینگیں آسمان تک لے جانے کے مقابلے کریں اور بچے گلیوں میں "کالیاں اناں کالے روڑ، مینہ وسادے روز وروز" کے نعرے لگاتے پھریں تو سمجھ لیں کہ یہ ساون کا مہینہ ہے۔ گرمیوں کے مہینوں میں ساون بارشوں کے حوالے سے ایک اہم اور رومانوی مہینہ مانا جاتا ہے۔ اس مہینہ میں اگر بارشیں تسلسل سے ہوتی رہیں تو خوب صورت اور اگر بارشوں کے بعد تیز دھوپ نکلے تو شدید حبس، باڑ کے بعد آنے والے اس مہینہ کا مزاج نسبتاً مختلف ہوتا ہے، کالی گھنگھور گھٹائیں اچانک جھوم کے اٹھتی ہیں اور

صفحہ 4 بقیہ نمبر 3

بقیہ | رومانوی مہینہ | 3

تیز ہواؤں کا امتزاج انہیں مزید خوبصورت اور برق رفتار بنا دیتا ہے۔ دیہاتوں اور قصبوں میں بچے "کالیاں اناں کالے روڑ" مینہ وسادے زور وزور کے نعرے لگاتے گلیوں میں نکل آتے ہیں، جب چھت پر سونے کا رواج عام تھا تو کالی گھٹائیں اٹھتے ہی مرد و خواتین چھتوں پر چڑھ جاتے اور چارپائیوں کو اتارنے کا منظر دیدنی ہوتا۔ اور ہر طرف چھتوں پر رونقیں ہی رونقیں ہوتیں، بارش سے پہلے ابابیلیں ہوا میں اٹکھیلیاں کرتی دکھائی دیتیں، جب کالے بادل تیزی سے چھا جاتے اور نیچے سے آندھی کے جھونکے اٹھنے کو ہوتے تو کوے اور چیلیں اڈیاریاں مارتے جنہیں دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا کہ چند لمحوں میں تیز ہوا چلنے والی ہے۔ جب ساون کی جھڑی لگ جاتی اور کھیتوں میں جمع پانی میں بارش کے چھینٹوں سے بلبلے سے بننے لگتے تو پوڑے پکانے کا اہتمام کیا جاتا۔ میدہ اور گڑ ملے محلول کو توے پر پھیلایا جاتا اور پیپل کے پتوں سے انکی نوک پلک سنواری جاتی اور انہیں توے پر پلٹا جاتا، ساتھ میں نمکین کھیر تیار کی جاتی، سوجی کا حلوہ بنایا جاتا اور کہیں گڑ والے چاول پکائے جاتے، دوپہر کو میٹھی روٹی اور لیموں کا اچار من بھاتا کھا جا بن جاتا، ساون کی بارش وسیع علاقہ کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے اور جب سہ پہر ڈھلنے اور شام سے کچھ پہلے بادل چھٹتے ہیں اور دھوپ کے آخری نظارے دکھائی دیتے ہیں تو اگلے روز مزید بارش کی پیشگوئی قرار دیے جاتے، بادل چھٹنے اور دھوپ نکلنے کے دوران آسمان پر سات رنگوں کی قوس قزح بھی نمودار ہوتی جسے گھر کی مچھ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ شام کو جلیبی دیے اور قہقہے لگائے جاتے ہیں اور حبس ہو جاتا اور جلنے کیلئے بے تاب پروانے راہ بھٹک کر کپڑوں میں گھس جاتے ہیں اور اچھے بھلے معززین بھی گھبراہٹ میں احمقانہ حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ رات کو جب بارش میں بھیگی چارپائیوں کو بچھانے کی کوشش کی جاتی تو لکڑی کی چارپائیوں کو سیدھا کرنا ممکن نہ ہوتا ان کو کان پر جاتی (ٹیڑھی ہو جاتیں) انہیں سیدھا کرنے کیلئے بچوں کو کبھی اس پائے بٹھایا جاتا تو کبھی اس پائے۔ تاہم ساون کے مہینہ کی ایک خصوصیت بڑی نمایاں ہے کہ اس میں سر شام بارش ہو سکتی ہے۔ دن کو بارش ہو سکتی ہے لیکن رات کو بارش نہیں ہوتی۔ آدھی رات کے بعد "صبح کاذب" کا وقت ہوتا ہے تو بارش آتی ہے، ساون کا پسینہ اتنا تیزابی ہوتا ہے کہ کپڑوں کے رنگ بدل جاتے ہیں اور کاٹن کے کپڑے تیزابیت سے بوسیدہ ہو جاتے ہیں۔ ساون میں کوئلیں چھوتی ہیں اور نئے پتے نکلتے ہیں تو ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر دکھائی دیتا اور اسی بنا پر یہ محاورہ مشہور ہے "ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے" جنوبی پنجاب میں لوگ ایک دوسرے خاندان کو اپنے ہاں "ساؤنی" کی دعوت دیتے اور سارا دن چٹ پٹے اور میٹھے پکوانوں کے علاوہ آموں سے مہمانوں کی خدمت کی جاتی اور بارش میں نہانے کا انتظام کیا جاتا، منیاریں پینگیں جھولتیں اور جوانی کے زور پر آسمان کو چھونے کی کوشش کرتیں۔ نئی نویلی دلہنیں بُرکھا رت سکھیوں کے ہمراہ منانے کیلئے میکے آتیں اور باغوں میں پینگیں جھولتے ہوئے پیا ملن کے گیت گاتیں اور جو دلہنیں کسی مجبوری کے تحت میکہ نہ آسکتیں وہ بھیگے موسم میں سسرال میں بیٹھی میکے کے گاؤں کو یاد کر کے جدائی کے گیت گاتیں، چٹ پٹے کھانوں، پکوڑوں اور پوڑوں کے پکوان اس رت کو مزید یادگار بنا دیتے اور میٹھی روٹی کے ساتھ لیموں کا اچار اور بعد میں میٹھے آموں کا رس روح تک اپنی تاثیر چھوڑ جاتا، غربت اور معاشی بدحالی نے غریبوں سے تو ساون کی جھڑی منانے کی استطاعت چھین لی ہے اور امیروں نے اب زندگی کو ایئر کنڈیشنڈ کمروں تک محدود کر لیا ہے۔ بچے بھی ویڈیو گیمز اور موبائل فونز اور کمپیوٹر کی دنیا میں اسقدر گم ہو گئے ہیں کہ انہیں بھی اب بارش کے پانی میں کاغذ کی کشتی چھوڑنے کی تفریح یاد نہیں رہی اور نہ ہی اب کاغذ کی ناؤ بنانے کا فن ہی باقی رہا ہے۔ اب تو "بند کمروں" کے مکینوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ ساون کب آیا اور کب چلا گیا۔

ساون کے بعد بھادوں دراصل بدلتی رُتوں کا پیامبر

بارش کے بعد حبس ہوجائے تو سانس لینا بھی دوبھر ہوجاتا ہے

کاموکی (نامہ نگار) جب کالی گھٹائیں بن برسے گذرنے لگیں اور دھوپ کے رنگ پیلے ہونے لگیں جب بارش اور دھوپ ایک ساتھ جلوے دکھائیں اور سائے لمبے ہونے لگیں، جب کالے سیاہ بادل شرلاٹے بھرتی ہواؤں کے کندھوں پر سوار ہوکر آئیں اور ہلکی سی بارش کے بعد ہوا بند ہوجائے اور حبس ہوجائے تو سمجھ لیں کہ یہ بھادوں کا مہینہ ہے۔ ساون کے بعد آنے والا بھادوں در اصل بدلتی رُتوں کا پیامبر ہوتا ہے اور اتنا متلوں مزاج ہے کہ پل پل موسم بدلتا رہتا ہے۔ بھادوں کے مہینہ میں اگر ہوا چلے تو موسم انتہائی خوشگوار اور زندگی بھرا ہوتا ہے لیکن اگر بارش کے بعد حبس ہوجائے تو سانس لینا بھی دوبھر ہوجاتا ہے اور انسان کے جسم سے پھوٹنے والا پسینہ زندگی اجیرن کردیتا ہے۔ بھادوں میں ساون کی طرح لمبے علاقوں میں بارش نہیں ہوتی اور نہ ہی جھڑی لگتی ہے۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے کسی بھی سمت سے کالی گھٹا اُٹھتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے تیز شرلاٹے دار ہواؤں پر سوار ہر طرف اتنی تیزی سے چھاجاتی ہے کہ سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ کالی گھٹاؤں کے پیش منظر میں سفید پرندے، کبوتر، بگلے اور سفید پتنگیں عجیب خوش نظر منظر پیش کرتی ہیں۔ بھادوں کی بارش بھی عجیب ہوتی ہے کہ ایک چھت پر جل تھل ہورہی ہوتی ہے اور ساتھ والی چھت خشک ہوتی ہے۔ اکثر بادل بن برسے ہی گذر جاتے ہیں۔ پیچھے ٹھنڈی اور خوشگوار ہوائیں چھوڑ جاتے ہیں۔ اور ٹھنڈی ہواؤں میں ابابیل، چڑیاں اور کونلیں اٹھکیلیاں کرتے خوب صورت منظر پیش کرتے ہیں۔ بھادوں کی دوپہروں میں سفید بادل بلندی پر گھومتے رہتے ہیں اور ٹھنڈے بگولے اُٹھتے رہتے ہیں۔ سورج کے ساتھ پہاڑ جیسے بڑے بڑے بادلوں کی آنکھ مچولی جاری رہتی ہے۔ بھادوں کی دوپہروں میں چیلوں کی پروازیں بلند ہوجاتی ہیں۔ اور وہ سفید بادلوں کو چھونے کی کوشش میں بلند سے بلند ہوتی جاتی ہیں۔ دوپہر ڈھلتے ہی دھوپ کا رنگ بدلتے لگتا ہے سائے لمبے ہوجاتے ہیں۔ شامیں رومانوی اور اداس ہوتی ہے اور راتیں اوس بھری اور اکثر اوقات خوشگوار ہوتی ہیں۔

روزنامہ جنگ لاہور (2) 25 اگست 2018

بھادوں کا مہینہ، جب کالی گھٹائیں بن برسے گذرنے لگیں

ساون کے بعد آنے والا بھادوں بدلتی رُتوں کا پیامبر ہوتا ہے

کاموکی (نمائندہ جنگ) جب کالی گھٹائیں بن برسے گذرنے لگیں، دھوپ کے رنگ پیلے ہونے لگیں، جب بارش اور دھوپ ایک ساتھ جلوے دکھائیں اور سائے لمبے ہونے لگیں، جب کالے سیاہ بادل شرلاٹے بھرتی ہواؤں کے کندھوں پر سوار ہوکر آئیں اور ہلکی سی بارش کے بعد ہوا بند ہوجائے اور حبس چماسا ہوجائے تو سمجھ لیں کہ یہ بھادوں کا مہینہ ہے، ساون کے بعد آنے والا بھادوں دراصل بدلتی رُتوں کا پیامبر ہوتا ہے، اور اتنا متلوں مزاج ہے کہ پل پل موسم بدلتا رہتا ہے، بھادوں کے مہینہ میں اگر ہوا چلے تو موسم انتہائی خوشگوار اور زندگی بھرا ہوتا ہے لیکن اگر بارش کے بعد حبس ہوجائے تو سانس لینا بھی دوبھر ہوجاتا ہے، انسان کے جسم سے پھوٹنے والا پسینہ زندگی اجیرن کردیتا ہے، بھادوں میں ساون کی طرح لمبے علاقوں میں بارش نہیں ہوتی اور نہ ہی جھڑی لگتی ہے، بس دیکھتے ہی دیکھتے کسی بھی سمت سے کالی گھٹا اُٹھتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے تیز شرلاٹے دار ہواؤں پر سوار ہر طرف اتنی تیزی سے چھاجاتی ہے کہ سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا، کالی گھٹاؤں کے پیش منظر میں سفید پرندے، کبوتر، بگلے اور سفید پتنگیں عجیب خوش نظر منظر پیش کرتی ہیں، بھادوں کی بارش بھی عجیب ہوتی ہے کہ ایک چھت پر جل تھل ہورہی ہوتی ہے اور ساتھ والی چھت خشک ہوتی ہے، اکثر بادل بن برسے ہی گذر جاتے ہیں، پیچھے ٹھنڈی اور خوشگوار ہوائیں چھوڑ جاتے ہیں، اور ٹھنڈی ہواؤں میں ابابیل، چڑیاں اور کونلیں اٹھکیلیاں کرتے خوب صورت منظر پیش کرتے ہیں، بھادوں کی دوپہروں میں سفید بادل بلندی پر گھومتے رہتے ہیں اور ٹھنڈے بگولے اُٹھتے رہتے ہیں، سورج کے ساتھ پہاڑ جیسے بڑے بڑے بادلوں کی آنکھ مچولی جاری رہتی ہے، بھادوں کی دوپہروں میں چیلوں کی پروازیں بلند ہوجاتی ہیں، اور وہ سفید بادلوں کو چھونے کی کوشش میں بلند سے بلند ہوتی جاتی ہیں، دوپہر ڈھلتے ہی دھوپ کا رنگ بدلتے لگتا ہے سائے لمبے ہوجاتے ہیں، شامیں رومانوی اور اداس ہوتی ہے، اور راتیں اوس بھری اور اکثر اوقات خوشگوار ہوتی ہیں۔

پیر 28 ذیقعد 1438ھ 21 اگست 2017ء 6 بھادوں 2074ب

موسم کی تبدیلی اور پردیسی پرندوں کی آمد سے رونقیں بحال

پرندوں نے پاکستانی دریاؤں، ندی نالوں اور پہاڑی علاقوں میں ڈیرے جمانا شروع کردیئے

گوجرانوالہ (نمائندہ جنگ) موسم کی تبدیلی اور پردیسی پرندوں کی آمد سے دریاؤں، ندی نالوں کی رونقیں بحال ہونے لگیں۔ موسم میں تبدیلی آتے ہی روسی ریاستوں اور چائنہ میں برف باری کے باعث آبی پرندوں نے گرم پانی کا رخ کرلیا ہے۔ مذکورہ پرندوں نے لمبی اڑان کرکے پاکستانی دریاؤں، ندی نالوں، پانڈ ایریاز اور پہاڑی علاقوں میں ڈیرے جمانا شروع کر دیئے ہیں اور یہ سلسلہ دسمبر کے آخر تک جاری رہیگا۔ موسم تبدیلی کیساتھ ہی مرغابی کی مختلف اقسام بنڑی، جنگلی کبوتر، نیلا مرغا، بلے، چاہے، مگ، جل مرغی، فاختہ ودیگر پرندوں کی آمد سے پاکستان کے دریاؤں، ندی نالوں، پانڈ ایریاز، بارڈر ایریاز، جھمب، کھیتوں کھلیانوں کی رونقیں بحال اور سوریلی آوازوں سے گونجنا شروع ہوگئی ہیں۔ مرغابی کے شکار کیلئے شکاریوں نے بندوقیں، ودیگر آلات تیار کرلئے ہیں۔ پردیسی پرندے گوجرانوالہ ریجن میں ہیڈ مرالہ، ہیڈ خانکی، ہیڈ چھناواں، ہیڈ رسول، ہیڈ قادرآباد، سرائے عالمگیر، انڈیا کا بارڈر ایریا سمیت دیگر علاقہ جات کی ندی نالوں اور شکار گاہوں کو اپنا مسکن بنانا شروع کردیا جبکہ مرغابی کے شکار کیلئے شکاریوں کے بندوقیں، ودیگر آلات تیار کرلئے ہیں اور دوسری طرف غیر قانونی شکار پر قابو پانے کیلئے ڈویژنل ریڈ پارٹی کے علاوہ ڈویژن بھر میں 6 ٹیمیں تشکیل دے دی گئی ہیں اور شکارگاہوں کے داخلی وخارجی راستوں پر عارضی چوکیاں بھی قائم کردی گئی ہیں۔

روزنامہ جنگ لاہور (6) 11 نومبر 2018ء

دھان کی کٹائی کا موسم، کھیت سے منڈی تک رونقیں

کہیں عارضی ہوٹل قائم تو کہیں جلیبیوں اور مٹھائی کی دکانیں کھل گئیں

کامونکی (نامہ نگار) دھان کی کٹائی کا موسم، کھیت سے منڈی تک رونقیں، کہیں عارضی ہوٹل قائم تو کہیں جلیب اور مٹھائی کی دکانیں کھل گئیں۔ بھانڈ میراثی بھی کھیتوں میں پہنچ کر زمینداروں کی شجرہ نسب بیان کرنے لگے۔ دھان کی کٹائی کا سیزن عروج پر ہے۔ غلہ منڈی میں رش ہی رش ہے اور مزدوروں کی وجہ سے غلہ منڈی میں عارضی ہوٹل کھل گئے اور جلیبی کا کام بھی عروج پر ہے۔ غلہ منڈی میں مانگنے والوں کا بھی رش ہے جو ہر زمیندار سے دانے مانگ کر دھان جمع کررہے ہیں جبکہ کھیتوں میں کٹائی کے وقت بھانڈ میراثی پہنچ کر زمینداروں کے شجرہ نسب بیان کرکے دھان میں اپنا حصہ وصول کرتے ہیں جبکہ کھیت سے منڈی تک بھی جگہ جگہ جلیب، مٹھائی اور مونگ پھلی کی دکانیں کھل گئی ہیں۔ جہاں پر کاشتکار اپنی فصل کا کچھ حصہ دیکر اُن سے جلیبی اور مونگ پھلی خریدتے ہیں۔

روزنامہ جنگ لاہور (2) 10 ستمبر 2018ء

شام کو ٹھنڈی ہوائیں، بھادوں کی رُخصتی کے دن آگئے

ہر طرف پہاڑوں کی شکل کے بلند سفید بادل دکھائی دیتے ہیں

کامونکی (نامہ نگار) بھادوں کی رُخصتی کے دن، لمبے سائے، پیلی دھوپ اور پہاڑوں کی شکل کے بادل، شام کو زندگی سے بھرپور ٹھنڈی ہوائیں جبس، کیڑے مکوڑوں اور گرمی کے مہینے بھادوں کی رُخصتی کے دن قریب آگئے ہیں تو موسم نے بھی انگڑائی لینا شروع کردی ہے۔ دھوپ نے بھی رنگ بدل لئے ہیں اور اب پیلی دھوپ دکھائی دیتی ہے۔ سائے لمبے ہونا شروع ہوگئے ہیں اور شمال مغرب کی طرف سے ہر طرف پہاڑوں کی شکل کے بلند سفید بادل دکھائی دیتے ہیں۔ آسمان پر چیلیں اور کوے دوپہر کے وقت بلند پروازیں کرنے لگے ہیں، شام کو بسیروں کی طرف لوٹتے پرندوں کی اُڑان میں مستی آگئی ہے۔ شامیں انتہائی سُہانی ہوگئیں ہیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ انسانوں میں بھی موسم کھلنے کے ساتھ مزاج کی تبدیلی شروع ہوگئی اور راتوں کو زندگی سے بھرپور ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہوگئیں۔

روزنامہ جنگ لاہور (2) 10 ستمبر 2018ء

گندم کے سنہری کھیتوں نے دھرتی کے حسن کو دوبالا کردیا

کسان گندم کی کٹائی کیلئے تیار، فطرت کے ان دلکش نظاروں سے ہر سو خوشی کا سا سماں

پنڈی بھٹیاں (نامہ نگار) پانچ دریاؤں کی دھرتی نے موسم کی کروٹ کے ساتھ ہی سنہری دلہن کا روپ دھارلیا اور گندم کے سنہری کھیتوں نے دھرتی کے حسن کو دوبالا کردیا۔ فطرت کے ان دلکش نظاروں میں کسانوں کے چہروں پر بھی خوشیاں بکھرتی اور پرندوں کی چہک مہک چرندوں کی آوازیں قدرت کے انعام پر شکرانے کے گیت گاتے اور گندم کی کٹائی تیاریوں میں مصروف ہوگئے ہیں قدرت نے ان کی انتھک محنت کا صلہ جو دیا اس رزق میں انسانوں، چرند، پرند، اور حشرات کا رزق شامل ہے چار سُو گندم کے سنہری لہراتے کھیت جہاں خوشیوں کا پیغام لے کر آئے ہیں وہاں قدرتی حسن کا نظارہ بھی پیش کرنے لگے ہیں جبکہ کسانوں کاشتکاروں نے کٹائی کے لیے کمبائین تھریشروں کے ساتھ ساتھ روایتی طریقے سے کٹائی کرنے کیلئے مزدوروں، محنت کشوں اور دستی آلات کے حصول کیلئے کوششیں شروع کر رکھی ہیں کہیں کہیں ایکا دوکا کھیتوں میں گندم کی کٹائی کا آغاز ہوگیا ہے اور اپریل کے وسط تک ساندل بار میں گندم کی کٹائی کا کام روایتی اور جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ شروع ہوجائے گا دھرتی کا سنہری زیور جو کہ اس نے سجا رکھا ہے اس کو دیکھ کر ہر زبان پر یہی ہے محنت کا صلہ قدرت کی بڑی نعمت ہے آلودگی سے پاک فضا میں دھرتی کا سنہری روپ دل ودماغ کو سکون دینے لگا ہے

روزنامہ جنگ لاہور (6) 7 اپریل 2017ء

ساون کے بعد بھادوں دراصل بدلتی رُتوں کا پیامبر

بارش کے بعد حبس ہوجائے تو سانس لینا بھی دوبھر ہوجاتا ہے

کاموکی (نامہ نگار) جب کالی گھٹائیں بن برسے گذرنے لگیں اور دھوپ کے رنگ پیلے ہونے لگیں جب بارش اور دھوپ ایک ساتھ جلوے دکھائیں اور سائے لمبے ہونے لگیں، جب کالے سیاہ بادل شرلاٹے بھرتی ہواؤں کے کندھوں پر سوار ہوکر آئیں اور ہلکی سی بارش کے بعد ہوا بند ہوجائے اور حبس ہوجائے تو سمجھ لیں کہ یہ بھادوں کا مہینہ ہے۔ساون کے بعد آنے والا بھادوں در اصل بدلتی رُتوں کا پیامبر ہوتا ہے اور اتنا متلوں مزاج ہے کہ پل پل موسم بدلتا رہتا ہے۔ بھادوں کے مہینہ میں اگر ہوا چلے تو موسم انتہائی خوشگوار اور زندگی بھرا ہوتا ہے لیکن اگر بارش کے بعد حبس ہوجائے تو سانس لینا بھی دوبھر ہوجاتا ہے اور انسان کے جسم سے پھوٹنے والا پسینہ زندگی اجیرن کردیتا ہے۔ بھادوں میں ساون کی طرح لمبے علاقوں میں بارش نہیں ہوتی اور نہ ہی جھڑی لگتی ہے۔بس دیکھتے ہی دیکھتے کسی بھی سمت سے کالی گھٹا اُٹھتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے تیز شرلاٹے دار ہواؤں پر سوار ہر طرف اتنی تیزی سے چھاجاتی ہے کہ سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔کالی گھٹاؤں کے پیش منظر میں سفید پرندے، کبوتر، بگلے اور سفید پتنگیں عجیب خوش نظر منظر پیش کرتی ہیں۔ بھادوں کی بارش بھی عجیب ہوتی ہے کہ ایک چھت پر جل تھل ہورہی ہوتی ہے اور ساتھ والی چھت خشک ہوتی ہے۔اکثر بادل بن برسے ہی گذر جاتے ہیں۔ پیچھے ٹھنڈی اور خوشگوار ہوائیں چھوڑ جاتے ہیں۔اور ٹھنڈی ہواؤں میں ابابیل، چڑیاں اور کونپلیں اٹھکیلیاں کرتے خوب صورت منظر پیش کرتے ہیں۔بھادوں کی دوپہروں میں سفید بادل بلندی پر گھومتے رہتے ہیں اور ٹھنڈے بگولے اُٹھتے رہتے ہیں۔سورج کے ساتھ پہاڑ جیسے بڑے بڑے بادلوں کی آنکھ مچولی جاری رہتی ہے۔ بھادوں کی دوپہروں میں چیلوں کی پروازیں بلند ہوجاتی ہیں۔اور وہ سفید بادل بلندی سے بلند ہوتی جاتی ہیں، دوپہر ڈھلتے ہی دھوپ کا رنگ بدلنے لگتا ہے سائے لمبے ہوجاتے ہیں۔شامیں رومانوی اور اداس ہوتی ہے اور راتیں اوس بھری اور اکثر اوقات خوشگوار ہوتی ہیں۔

روزنامہ جنگ لاہور (2) 25 اگست 2018

بھادوں کا مہینہ، جب کالی گھٹائیں بن برسے گذرنے لگیں

ساون کے بعد آنے والا بھادوں بدلتی رُتوں کا پیامبر ہوتا ہے

کاموکی (نمائندہ جنگ) جب کالی گھٹائیں بن برسے گذرنے لگیں، دھوپ کے رنگ پیلے ہونے لگیں، جب بارش اور دھوپ ایک ساتھ جلوے دکھائیں اور سائے لمبے ہونے لگیں، جب کالے سیاہ بادل شرلاٹے بھرتی ہواؤں کے کندھوں پر سوار ہوکر آئیں اور ہلکی سی بارش کے بعد ہوا بند ہوجائے اور حبس چماسا ہوجائے تو سمجھ لیں کہ یہ بھادوں کا مہینہ ہے، ساون کے بعد آنے والا بھادوں دراصل بدلتی رُتوں کا پیامبر ہوتا ہے، اور اتنا متلوں مزاج ہے کہ پل پل موسم بدلتا رہتا ہے، بھادوں کے مہینہ میں اگر ہوا چلے تو موسم انتہائی خوشگوار اور زندگی بھرا ہوتا ہے لیکن اگر بارش کے بعد حبس ہوجائے تو سانس لینا بھی دوبھر ہوجاتا ہے، انسان کے جسم سے پھوٹنے والا پسینہ زندگی اجیرن کردیتا ہے، بھادوں میں ساون کی طرح لمبے علاقوں میں بارش نہیں ہوتی اور نہ ہی جھڑی لگتی ہے، بس دیکھتے ہی دیکھتے کسی بھی سمت سے کالی گھٹا اُٹھتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے تیز شرلاٹے دار ہواؤں پر سوار ہر طرف اتنی تیزی سے چھاجاتی ہے کہ سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا، کالی گھٹاؤں کے پیش منظر میں سفید پرندے، کبوتر، بگلے اور سفید پتنگیں عجیب خوش نظر منظر پیش کرتی ہیں، بھادوں کی بارش بھی عجیب ہوتی ہے کہ ایک چھت پر جل تھل ہورہی ہوتی ہے اور ساتھ والی چھت خشک ہوتی ہے، اکثر بادل بن برسے ہی گذر جاتے ہیں، پیچھے ٹھنڈی اور خوشگوار ہوائیں چھوڑ جاتے ہیں، اور ٹھنڈی ہواؤں میں ابابیل، چڑیاں اور کونپلیں اٹھکیلیاں کرتے خوب صورت منظر پیش کرتے ہیں، بھادوں کی دوپہروں میں سفید بادل بلندی پر گھومتے رہتے ہیں اور ٹھنڈے بگولے اُٹھتے رہتے ہیں، سورج کے ساتھ پہاڑ جیسے بڑے بڑے بادلوں کی آنکھ مچولی جاری رہتی ہے، بھادوں کی دوپہروں میں چیلوں کی پروازیں بلند ہوجاتی ہیں، اور وہ سفید بادلوں کو چھونے کی کوشش میں بلند سے بلند ہوتی جاتی ہیں، دوپہر ڈھلتے ہی دھوپ کا رنگ بدلنے لگتا ہے سائے لمبے ہوجاتے ہیں، شامیں رومانوی اور اداس ہوتی ہے، اور راتیں اوس بھری اور اکثر اوقات خوشگوار ہوتی ہیں۔

پیر 28 ذیقعد 1438ھ 21 اگست 2017ء 6 بھادوں 2074ب

روزنامہ جنگ لاہور (6) 13 اپریل 2017ء

کامونکی، جگنوؤں کے موسم میں باغوں اور بن میں تاریکیوں کا راج

شام کو ہر طرف درختوں کے پھولوں کی رومان پرور مہک پھیل جاتی ہے

کامونکی (نامہ نگار) جگنوؤں کے موسم میں باغوں اور بن میں تاریکیوں کا راج، ٹمٹماتے ننھے دیئے اب خال خال ہی نظر آتے ہیں، موسم بہار کے آخری دنوں میں گرمی کی آمد ہوتی تو باغوں اور کھیتوں میں سرِ شام سے جگنوؤں کی قطاریں ایسے نظر آتیں جیسے کئی ایک شمعیں جل رہی ہوں، موسم بہار کے آخری دنوں میں نیم، دھریک اور ٹاہلی کے درختوں کو پھول پڑ جاتے، کیکر کے پیلے اور سُرخ پھول پکنے کو تیار ہوتے اور شریں کے درخت کو پھلیاں لگ جاتیں، شام کو ہر طرف درختوں کے پھولوں کی رومان پرور مہک پھیل جاتی، ذرا سا اندھیرا پھیلتا تو بن، باغوں اور کھیتوں میں ننھے دیئے ٹمٹمانے لگتے، اور یوں لگتا جیسے کئی دیئے جلا کر کھیتوں میں رکھ دیئے گئے ہوں، کاشتکار گندم کی تیار فصل میں جگنوؤں کی قطاریں دیکھتا تو اُسے یوں لگتا ہے کہ اُسکی فصل پکنے کی خوشی میں جگنو بھی شریک ہیں، اور وہ چراغاں کر کے اپنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں، زرعی کیرے مار ادویات کے سپرے اور کھادوں کی وجہ سے یہ ننھا دیا تیزی سے بجھ رہا ہے، اب نہ ہی یہ کسی بُلبل کو راہ دکھانے کے قابل رہا ہے اور بقول اقبال جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں یا کوئی شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں لیکن اب رات کو پھولوں کی انجمن میں بھی تاریکیوں کا راج رہتا ہے۔

روزنامہ جنگ لاہور (2) 8 فروری 2018ء

دھوپ میں حدت، ہواؤں میں ٹھنڈک، کونپلیں پھوٹنے کو بے قرار

بسنت بہار کی آمد پر باغوں میں سبزے نے رنگ بدل لئے، بارشوں کے بعد موسم کھلتا ہے

کامونکی (نامہ نگار) دھوپ میں حدت، ہواؤں میں ٹھنڈک، درختوں پر کونپلیں پھوٹنے کو بے قرار، کلیاں پھول بننے کی خواہش سے لبریز، بسنت بہار کی آمد پر باغوں میں سبزے نے رنگ بدل لئے، دیہات میں سرسوں کے پیلے پھول بھرپور جوان ہو گئے تو شہروں میں گنا اور گیندے کے پھول کھلنے لگے۔ شہروں میں گھاس نے سبز لباس پہنے ہیں تو دیہاتوں میں گندم کی میلوں تک پھیلی فصل نے گہرے سبز چولے پہن لئے، ماگھ کے آخری عشرہ میں موسم میں تبدیلی آتی ہے اور بارشوں کے بعد موسم کھلتا ہے تو ماحول میں رومانویت آجاتی ہے، عاشقوں کی طبیعت میں بے چینی اور جوان دلوں میں امنگیں پروان چڑھنے لگتی ہیں۔ نیلے گگھن پر پردیسی پرندے وطنوں کو واپسی کی خوشی میں اٹھکیلیاں کرتے ڈاروں کی شکل میں سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ دھوپ میں تمازت آنے کے بعد باغوں اور ویرانوں میں گھاس رنگ بدل لیتی ہے اور ان میں سبز زندگی نظر آنے لگتی ہے۔ کھیتوں میں گندم کی نشوونما بھی بڑھ جاتی ہے اور زندگی سے بھرپور تیز ہوا میں لہلہاتے گندم کے سبز پودے دیکھ کر کاشتکار کے چہرے پر مستقبل کے سہانے سپنوں کے رنگ بکھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پت جھڑ کا شکار درختوں پر پھر سے زندگی کی بہار نظر آنے لگتی ہے۔ کونپلیں پھوٹنے کو بے قرار نظر آتی ہیں۔ کلیاں پھول بننے کے دنوں کا انتظار بے چینی سے کرتی ہیں۔ باغوں میں بہار آنے کو بے چین ہوتی ہے۔ گنا، ڈیلیا، گیندا، گلاب اور دیگر موسمی پھول تیز دھوپ اور ٹھنڈی ہوا میں اپنے حسن کی نمائش کے لیے بے اختیار جھومتے ہیں۔ عاشقوں کے لیے اس موسم کی دوپہر رومان بھری اور شام اداسیوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ مشرقی پنجاب میں اس موسم میں دیہاتوں میں میلے منعقد کئے جاتے ہیں۔ کسان پیلے پٹکے اور پیلی پگیں پہن کر اور خواتین پیلے ڈوپٹے اوڑھ کر خوشی کے گیت گاتیں ہیں اور محاورہ عام ہے کہ آئی بسنت اور پالا اڑنت۔ صدیوں سے پتنگ بازی کا میلہ بھی اسی موسم میں منعقد کیا جاتا ہے۔

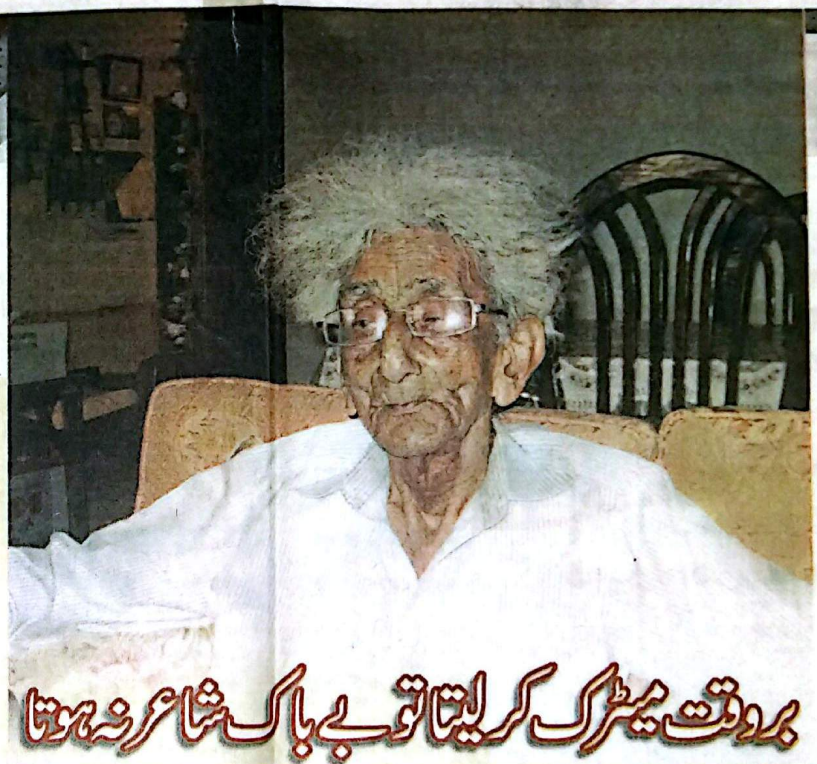
شخصیت

ایکسپریس

بروقت میٹرک کرلیتا تو بے باک شاعر نہ ہوتا

غلام محی الدین/اسلام آباد

شاعری میں احسان دانش کو استاد مانتا ہوں، ''اُس بازار'' کے شوق نے کنگلا کر دیا، مولانا آزاد مجھ سے دو چار باتیں کرنے کے بعد فوراً بولے مسلم لیگی لگتے ہو، میرا علم تدریسی کے بجائے مجلسی ہے، عہد حاضر کے معروف بزرگ شاعر سید نصرت زیدی کی جیون کتھا



معروف شاعر نصرت زیدی کا اصل نام مختار مہدی ہے۔ 1923 میں یوپی (بھارت) کے ضلع بجنور کے ایک گاؤں رامن میں پیدا ہوئے، جو بجنور کریمن ہوگیا۔ گاؤں کی آبادی دو ہزار کے قریب تھی، سارے سادات تھے اور سب پڑھے لکھے؛ اندازہ کیجیے 1937 میں ایس اکثر گریجوایٹ تھے۔ نصرت زیدی کے والد محترم سراج الحسن زیدی کلکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ زیدی صاحب کا نام نصرت علی زیدی ان کے دادا نے رکھا تھا لیکن والد صاحب نے جب نصرت کو میرٹھ کے ایک اسکول میں داخل کرایا تو اسکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی فیاض حسین نے حروف ابجد کے حساب سے لگا کر رحمٰن میں افتخار مہدی نام درج کیا۔ نصرت زیدی صاحب چوتھی تک یہاں پڑھے۔ چھٹی تک امروہہ اور آٹھویں تک مظفر نگر کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں زیر تعلیم رہے۔ اس کے بعد ایک بار پھر میرٹھ کے فیض عام ہائی اسکول میں بھیجے گئے، یہاں دسویں درجے میں پہنچ تو لیے تھے لیکن پڑھنے سے پھر گئے۔ 1943 کا سال تھا کہ ایں جانب اسکول سے بھاگ لیے۔ بھاگتے بھاگتے لاہور پہنچے اور ایک طلبہ کے ہاں پناہ گزیں ہوئے۔ پڑھائی وڑھائی تو جاتی رہی تھی، وقت گزارنے کا مسئلہ تھا، تفریح کے لیے کیرم کھیلنے لگ گئے اور ایسا کھیلے، ایسا کھیلے کہ شہر بھر میں نام کیا؛ بے شمار مقابلے جیتے۔ ایک مقابلہ جیتے تو کھیلے نے اپنے بھائی سے مقابلے کی سبارت دے ڈالی، یہ تیار؛ اگلے روز کینال پارک میں مقابلہ ہوا۔ اسٹار انگیز نصرت صاحب کے ہاتھ آیا تو ان کی آہ سرد کر گیا، مقابلہ حیرت سے تکتا کہ ان کی بار یک انگلیاں دیکھتے رہ گئے۔ وہ یوں باتوں میں انہیں معلوم ہوا کہ میمن گاؤں کے ایک صاحب اسی نواح میں رہتے ہیں۔ شکست خوردہ بھائیوں نے انہیں اُن سے ملوایا۔ اُن کا نام شجاعت علی صدیقی تھا، جو بعد میں ملٹری اکاؤنٹس جنرل کے عہدے تک پہنچے، نیک نیت انسان تھے، نصرت صاحب کے احوال سے آگاہ ہوئے، یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جناب باقی بلا کے ہیں، دسویں سے آگے پڑھا بھی نہیں پائے۔ انہوں نے اگلے روز ناشتے پر بلایا، یہ بروقت پہنچ لیے۔ ناشتے کے بعد صدیقی صاحب انہیں اپنے ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر لے گئے۔ وہاں انہیں استنبالیے پر چھوڑ صدیقی صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے، کچھ دیر بعد اندر بلائے گئے، جہاں دو اور معززین بھی تشریف رما تھے۔ دونوں میں سے کسی نے ان سے نام پوچھا، تو کہا: ''صدیقی صاحب میرا نام جانتے ہیں''۔ اس پر سارے ہنس پڑے۔ یہ زیدی صاحب کی زندگی کا پہلا اور آخری انٹرویو تھا۔ زیدی صاحب یوں ''فانی اکائم'' ہوئے کہ ایک کم چالیس برس بعد جب ایک اعلیٰ عہدے پر تھے تو ایک دن خیال آیا کہ کام کچھ زیادہ ہی کر بیٹھے ہیں سو ریٹائرمنٹ لے لی۔

نصرت زیدی صاحب اکیلے ہی لاہور میں رہائش پذیر ہوئے، پہلے تو والد صاحب نے انہیں واپس بلانا چاہا لیکن جب دیکھا کہ لوگر ہو گئے ہیں تو چپ ہو لیے۔ ''والد صاحب نے مجھے پڑھانے کی بہت کوشش کی مگر میں پڑھنا نہیں چاہتا تھا''۔ والد اکثر کہا کرتے تھے ''اگر تم نے پڑھنا نہیں تو اپنی آبائی زمینیں ہی سنبھال لو، ملازمتوں میں کیا رکھا ہے''۔ جب نصرت صاحب سے پوچھا گیا، اگر آپ اُس دور میں تعلیم مکمل کر لیتے تو کیا یہی نصرت زیدی ہوتے؟ ..... اس پر بھرپور قہقہہ لگا کر بولے ''میرا حرانی بالکل مختلف تھا، یہ میرا ہی نہیں، میری اکھوتی بیٹی کا بھی خیال ہے کہ میں تعلیم مکمل کر لیتا تو ایک مختلف انسان ہوتا۔ آج میں شاعر ہوں، حرے سے ساری زندگی شاعری کی، کسی کو مجھی گی پابری، میں نے پروا نہیں کی، اگر پڑھ لکھ جاتا تو بے باک شاعر نہ ہوتا''۔ یاد رہے کہ نصرت زیدی نے ایک عرصے بعد لاہور میں میٹرک اور ایف اے کیا اور پھر عربی فاضل کا امتحان پاس کیا لیکن وہ اس علم کو تدریسی کے بجائے مجلسی قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ''میں نے علم احسان دانش، شورش کاشمیری، خواجہ دل محمد، ول اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی جیسے عالم فاضل لوگوں سے حاصل کیا۔

نصرت زیدی جب لاہور کی فضاؤں میں رچ بس گئے تو اُن پر لاہور کا رنگ چڑھنے لگا۔ ایک دن شاعر دوست کے ساتھ لاہور کی ہیرا منڈی میں ایک طوائف کے کوٹھے پر گئے اور واپس آتے ہوئے دل وہیں چھوڑ آئے، بس پھر کیا تھا روزانہ گانا سننے کی لت پڑ گئی۔ ابھی تنخواہ تھی لیکن جیب خالی رہنے لگی۔ تنگ آ گئے تو افسروں سے درخواست کی ''میرا تبادلہ لاہور سے اتنی دور کر دیا جائے کہ آسانی سے لاہور نہ آ سکوں۔'' درخواست منظور ہوئی اور یہ ڈیرہ اسماعیل خان چلے گئے۔ وہاں خدا خدا کر کے طوائف کا کوٹھا بھلا پائے۔ ڈیرے میں تھے تو وہاں کے افغان ریشن آفیسر اختر شاہ سے چپقلش ہوگئی۔ اختر شاہ نے ایک اخبار کے ایڈیٹر کے خلاف مضمون لکھنے کو کہا، انہوں نے انکار کر دیا کیوں کہ وہ ایڈیٹر، زیدی صاحب کے دوست تھے، اُسی اخبار میں زیدی صاحب خود بھی مضامین لکھا کرتے تھے 1959 میں انہیں چار مضامین کا سو روپے معاوضہ ملا کرتا تھا۔ اس جھگڑے کے بعد انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا مگر اختر شاہ نے اُس وقت کی مارشل لا حکومت کو زیدی صاحب کی شکایت کر دی کہ نصرت دہریے ہیں اور کمیونسٹ ہیں، لہٰذا سیاست میں بھی حصہ لیتے ہیں اور حکومت کے خلاف تقریریں کرتے ہیں''۔ اس شکایت پر فوجیوں نے طلب کر لیا۔ خوش قسمتی یہ رہی کہ انکوائری جیوری میں ایک میجر سید علی تھے، جو زیدی صاحب کو صرف جانتے ہی نہ تھے بل کہ ان کی شاعری کے بھی مداح تھے۔ انہوں نے زیدی صاحب سے کہا ''جانتا ہوں آپ بے گناہ ہیں لیکن کاغذات میں مجھے آپ کو قید کرنا پڑے گا، شام کو میں آپ کو جیپ میں بٹھا کے گھر لے جاؤں گا، وہاں کھانا کھائیں گے، صبح واپس لا کر کاغذوں میں دوبارہ آپ کو قید ثابت کروں گا۔'' دوسرے دن جب بریگیڈیئر صاحب کے سامنے پیش کیے گئے تو وہ انہیں دیکھ کر حیران ہوئے، کہنے لگے ''21 اپریل کو گورنمنٹ کالج کے مشاعرے میں آپ نے علامہ اقبال پر جو کچھ پڑھا، وہ تو آپ کو کمیونسٹ ثابت نہیں کرتا۔'' کہتے ہیں ''میں سوچنے لگا، یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے، واقعی ڈیرہ اسماعیل خان میں اُن دنوں میں ہی سب سے بڑا شاعر ہوتا تھا، بریگیڈیئر صاحب نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور کہا، جس شخص نے آپ کے خلاف رپورٹ ارسال کی ہے، وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے، میں اُس کے خلاف کچھ نہیں لکھوں گا اور نہ ہی آپ اپنے دفاع میں اُس کے خلاف کچھ کہیں گے (البتہ) میں امریکا میں نائن الیون کے بعد دنیا پر اثرات اور میڈیا اور دانش وروں کا کردار'' کے موضوع پر بات کرنے کے لیے بلایا گیا۔ میں نے واشنگٹن میں اپنی باری پر ایک ہی جملہ کہا تھا کہ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے، اب دنیا کو مل کر اس پر سوچنا پڑے گا۔''

نصرت زیدی 1943 سے لے کر 1948 تک لاہور میں رہے، اس کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان چلے گئے، دو سال پٹاور میں قیامت ای رہے، وہاں سے 1963 میں راول پنڈی آ گئے اور بقیہ ملازمت اسی شہر میں مکمل کی۔ پٹاور میں قیام کے دوران انہیں ایک دن اپنے کزن، معروف شاعر مصطفیٰ زیدی کی ارجنٹ فون کال موصول ہوئی، وہ ان دنوں نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ فون پر انہیں ہدایت کی گئی کہ رقعی کو نوشہرہ لے کر فوراً نواب شاہ پہنچو، افقی زیدی، مصطفیٰ زیدی کے چھوٹے بھائی تھے، خبر ہم افراتفری میں پہنچے کہ جانے کیا اتفاق پڑتی ہے ''معلوم یہ ہوا کہ بارات نواب شاہ سے خیر پور جانی ہے اور بارات کسی میں ہی گیا، میری والدہ تک کو میرے نواب شاہ پہنچنے کے بعد ہی پتا چلا..... تو بھائی اس آوارہ گرد کو یوں زیر دام لایا گیا''۔

اس موقع پر اپنی مرحومہ بیوی کو یاد کر کے، اُن کی آواز بھرا گئی ''شادی کے بعد مجھے علم ہوا کہ ایک اچھی زندگی کیا ہوتی ہے، میں نے اپنی بیوی جیسی اچھی خاتون زندگی بھر نہیں دیکھی، مرحومہ کہا کرتی تھیں



آپ کو عزت بری کر رہا ہوں، آپ نے ایک دن کی جیل کاٹ لی، یہ کافی ہے''۔

نصرت صاحب چشم دید گواہ ہیں کہ پاکستان کیسے اور کن حالات میں بنا۔ نصرت زیدی 1946 میں روزنامہ پرتاب میں ادبی ایڈیشن کے انچارج کی حیثیت سے کام کیا کرتے تھے، جس کے انہیں 20 روپے ہفتہ ملتے تھے۔ 1946 میں خالصہ تحریک کا مسلم لیگ سے سمجھوتہ ہو چکا تھا کہ سکھ پر امن رہیں گے لیکن اس سمجھوتے کو ختم کرنے کے لیے کانگریس کے مولانا ابوالکلام آزاد لاہور خالصہ تحریک والوں سے ملنے آئے اور فلیٹیز ہوٹل میں قیام کیا۔ میرے اخبار کے مالک مہاشے کرشن نے مجھے اس کی اطلاع دی کہ کانگریس والے یہ سمجھوتہ ختم کر دیں گے، پھر کہا کہ شام کو میں فلیٹیز میں مولانا سے ملنے جا رہا ہوں، تم نے میرے ساتھ چلنا ہے تو چلو، میں تیار ہو گیا۔ وہاں مولانا مظہر علی اظہر بھی آئے ہوئے تھے، مولانا مظہر شیعہ تھے لیکن جماعت احرار کے سیکرٹری تھے، مسلم لیگ والے انہیں مولانا ادھر علی اُدھر کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔ شام کو جب ہم فلیٹیز پہنچے تو مولانا آزاد مجھ سے دو چار باتیں کرنے کے بعد فوراً بولے تم مجھے مسلم لیگی لگتے ہو۔ میں نے جواباً کہا ہاں ایک حد تک ہوں۔ اس پر انہوں نے آنکھیں لال کر کے کہا ''سنو! پاکستان بن تو جائے گا مگر رہے گا نہیں، بہت جھگڑے ہوں گے، لسانی، مذہبی، علاقائی، ہر طرح کے جھگڑے۔ آج سوچتا ہوں، اُن کی بات 1971 میں پوری ہو چکی لیکن آج کا پاکستان مولانا آزاد کے تصور سے بالکل مختلف ہے، جو اُن کے خواب وخیال میں بھی نہیں ہوگا۔ آج اگر یہاں جھگڑے فساد ہیں، تو یکجا نہیں ہوں گے، پاکستان ہمیشہ قائم رہے گا، میں پاکستان کی تاریخ پڑھ جب نظر ڈالتا ہوں تو مجھے محمد علی جناح کے بعد صرف ذوالفقار علی بھٹو ہی ایک لیڈر دکھائی دیتا ہے، جو پاکستان کو دنیا میں ایک نئی شناخت دے سکتا تھا، وہ پاکستان کے اصل مسائل کو حل کرنے میں سنجیدہ تھا''۔ کہا ''ایک بار مجھے

CamScanner

روزنامہ "ایکسپریس" گوجرانوالہ جمعۃ المبارک 27 صفر المظفر 1439ھ 3 نومبر 2017ء 17 نومبر 2074ب

رسول اللہ ﷺ کے چالیس اصول

زیرو پوائنٹ
جاوید چودھری



www.facebook.com/javed.chaudhry

میں نے برسوں پہلے انگریزی کی کسی طبی کتاب میں بہترین زندگی کے چالیس بہترین اصول پڑھے تھے میں نے وہ صفحات کاپی کر کے اپنے پاس رکھ لئے میں گاہے بگاہے یہ صفحات نکال کر پڑھتا رہتا تھا میں ان اصولوں پر عمل کی کوشش بھی کرتا تھا میں نے دس سال قبل تفاسیر اور احادیث کا مطالعہ شروع کیا تو پتہ چلا یہ چالیس اصول دنیا کے کسی طبی ادارے یا یورپ اور امریکا کے کسی سیلف ہیلپ انسٹی ٹیوٹ نے ڈویلپ نہیں کئے یہ تمام اصول ہمارے پیارے رسولؐ کی حیات طیبہ کا نچوڑ ہیں یہ سیرت النبیؐ سے اخذ کئے گئے ہیں ہمارے رسولؐ نے پوری زندگی اپنے اصحابؓ کو ان اصولوں کی ٹریننگ دی آپؐ کے صحابہ کرامؓ بہترین زندگی کے ان چالیس بہترین اصولوں کی چلتی پھرتی تصویر تھے میں نے اس دن سے ان اصولوں پر عبادت کی طرح عمل شروع کر دیا گو میں ابھی تک ان پر مکمل عملدرآمد نہیں کر سکا لیکن مجھے یقین ہے اللہ تعالیٰ میری توفیق میں ضرور اضافہ کرے گا اور میں کسی نہ کسی دن آپؐ کے وضع کردہ ان اصولوں پر عمل میں کامیاب ہو جاؤں گا یہ چالیس اصول کیا ہیں آپ وہ اصول اور ان اصولوں کی جدید سائنسی توجیہات ملاحظہ کیجئے مجھ سے اگر تشریح میں کوئی غلطی ہو جائے تو مجھے معاف کر دیجئے گا میرے لئے دعا بھی فرمایئے گا۔

آپؐ نے فرمایا فجر اور اشراق عصر اور مغرب اور مغرب اور عشاء کے دوران سونے سے باز رہا کرو۔ اس فرمان میں بے شمار طبی حکمتیں پوشیدہ ہیں مثلاً آج میڈیکل سائنس نے ڈسکور کیا کرہ ارض پر فجر اور اشراق کے دوران آکسیجن کی مقدار سب سے زیادہ ہوتی ہے ہم اگر اس وقت سو جائیں تو ہم اس آکسیجن سے محروم ہو جاتے ہیں اور یوں ہماری طبیعت میں بوجھل پن آ جاتا ہے ہم آہستہ آہستہ چڑچڑے اور بیزار ہو جاتے ہیں عصر سے مغرب اور مغرب سے عشاء کے درمیان بھی آکسیجن کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے ہم اگر اس وقت بھی سو جائیں تو ہمارا جسم آکسیجن کی کمی کا شکار ہو جاتا ہے اور ہم دس مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں دمہ بھی ان دس بیماریوں میں شامل ہے چنانچہ آپ یہ اوقات جاگ کر گزاریں آپ پوری زندگی صحت مند رہیں گے میرا تجربہ ہے ہم اگر ان تین اوقات میں واک کریں تو ہماری طبیعت میں بشاشیت آ جاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا بدبودار اور گندے لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھا کرو۔ یہ حکم بھی حکمت سے لبالب ہے بدبو انسان کو ڈپریس کرتی ہے جبکہ خوشبو ہماری توانائی میں اضافے کا باعث بنتی ہے انسان اگر روزانہ دس منٹ بدبودار اور گندے لوگوں میں بیٹھنا شروع کر دے تو یہ بیس دنوں میں ڈپریشن کا شکار ہو جائے گا ہمارے رسولؐ نے ہمیں شاید اسی لئے بدبودار لوگوں سے پرہیز کا حکم دیا آپ بھی یہ کر کے دیکھیں آپ کا مزاج بدل جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا ان لوگوں کے درمیان نہ سوئیں جو سونے سے قبل بری باتیں کرتے ہیں۔ یہ فرمان بھی حکمت کے عین مطابق ہے آج سائنس نے ڈسکور کیا نیند سے قبل ہماری آخری گفتگو ہمارے خوابوں کا موضوع ہوتی ہے اور یہ خواب ہمارے اگلے دن کا موڈ طے کرتے ہیں ہم اگر برا سن کر سوئیں گے تو ہم برے خواب دیکھیں گے اور ہمارے برے خواب ہمارے آنے والے دن کا موڈ بن جائیں گے ہم خوابوں کے طے کردہ موڈ کے مطابق دن گزارتے ہیں چنانچہ نیند سے قبل ہماری آخری محفل اچھی ہونی چاہیے ہمارا اگلا دن اچھا گزرے گا۔ فرمایا تم بائیں ہاتھ سے نہ کھاؤ۔ یہ فرمان بھی عین سائنسی ہے ہمارے دماغ کے دو حصے ہیں دایاں اور بایاں دایاں حصہ مثبت اور بایاں منفی ہوتا ہے ہم جب اپنے جسم کو دائیں ہاتھ سے "فیڈ" کرتے ہیں تو ہماری مثبت سوچ مضبوط ہوتی ہے اور ہم جب اپنے بدن کو بائیں ہاتھ سے کھلاتے ہیں تو ہماری منفی سوچ طاقتور ہوتی چلی جاتی ہے آپ مشاہدہ کر لیں آپ کو بائیں ہاتھ سے کھانے والے اکثر لوگ منفی ملیں گے یہ آپ کو ہمیشہ شکوہ شکایت غیبت اور دوسروں کو نقصان پہنچاتے نظر آئیں گے۔ فرمایا منہ سے کھانا نکال کر نہ کھاؤ۔ یہ فرمان بھی سائنس سے درست ثابت ہوتا ہے ہمارے منہ میں دس کروڑ سے ایک ارب تک بیکٹیریا ہوتے ہیں یہ بیکٹیریا مہلک جراثیم بن جاتے ہیں یہ جراثیم ہمارے کھانے میں مل جاتے ہیں یہ کھانا معدے میں جاتا ہے تو معدے کے غدود ان جراثیم کو مار دیتے ہیں یوں یہ ختم ہو جاتے ہیں لیکن جب ہم جراثیم ملے کھانے کو منہ سے نکال لیتے ہیں تو ان جراثیم کو آکسیجن مل جاتی ہے یہ آکسیجن سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ان جراثیم کی تعداد کھربوں تک پہنچا دیتی ہے یہ جراثیم معدے کے غدودوں سے بھی طاقتور ہوتے ہیں ہم جب منہ سے نکلے لقمے کو دوبارہ منہ میں رکھتے ہیں تو یہ لقمہ معدے میں پہنچ کر زہر بن جاتا ہے اور یہ زہر ہمارے پورے نظام ہضم کو تباہ کر دیتا ہے آپ کو زندگی میں کبھی کوئی ایسا شخص صحت مند نہیں ملے گا جسے منہ سے لقمہ نکال کر کھانے کی عادت ہو جبکہ آپ کو ہونٹ بھینچ کر اور آواز پیدا کئے بغیر کھانے والے لوگ ہمیشہ صحت مند ملیں گے۔

ہمارے رسولؐ نے فرمایا ہاتھ کے کڑاکے نہ نکالا کرو۔ سائنس کا کہنا ہے ہم میں سے جو لوگ انگلیوں کے کڑاکے نکالتے رہتے ہیں ان کے جوڑ کھلنا شروع ہو جاتے ہیں اور یہ جلد آرتھرائٹس کا شکار ہو جاتے ہیں یہ جوڑوں کے درد کی شکایت بھی کرتے ہیں۔ فرمایا جوتا پہننے سے قبل اسے جھاڑ لیا کرو۔ ہماری زندگی کے عام واقعات میں کیڑے مکوڑے بچھو چھپکلیاں چھوٹے سانپ اور بھڑیں ہمارے جوتوں میں پناہ لے لیتی ہیں ہمارے بچے بھی جوتوں میں کیل کانٹے اور بلیڈ پھینک دیتے ہیں چنانچہ ہم جب جوتا پہنتے ہیں تو ہمارے پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں یا پھر ہمیں کیڑے مکوڑے کاٹ لیتے ہیں لہٰذا جوتا پہننے سے قبل اسے جھاڑ لینا ہمیشہ فائدہ مند رہتا ہے۔ فرمایا نماز کے دوران آسمان کی طرف نہ دیکھو یہ فرمان بھی درست ہے آسمان میں ایک وسعت ہے یہ وسعت ہمیشہ ہماری توجہ کھینچ لیتی ہے ہم جب بھی آسمان کی طرف دیکھتے ہیں ہماری توجہ بٹ جاتی ہے ہمیں توجہ واپس لانے میں ٹھیک ٹھاک وقت لگتا ہے نماز کیلئے یکسوئی درکار ہوتی ہے ہم جب نماز کے دوران آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو ہم سجدے اور رکوع بھول جاتے ہیں چنانچہ حکم دیا گیا نماز کے دوران آسمان کی طرف نہ دیکھو یہ فارمولہ تخلیقی کاموں کیلئے بھی اہم ہے اگر لکھاری لکھتے مصور تصویر بناتے اور موسیقار دھن بناتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ لے تو اس کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے یہ اپنا کام مکمل نہیں کر پاتا شاید یہی وجہ ہے دنیا کا زیادہ تر تخلیقی کام بند کمروں میں مکمل ہوا یہ کھلی فضا میں پروان نہیں چڑھا بیتھوون کی سمفنیاں ہوں ڈاونچی کا لاسٹ سپر ہو یا پھر ٹالسٹائی کا وار اینڈ پیس دنیا کا ہر ماسٹر پیس بند کمرے میں تخلیق ہوا آپ تخلیق کا آئیڈیا لینا چاہتے ہیں تو آپ کھلے آسمان کے نیچے کھلی فضا میں واک کریں آپ آئیڈیاز سے مالا مال ہو جائیں گے لیکن آپ اگر ان آئیڈیاز پر کام کرنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کمرے میں بند ہو جائیں آپ کمال کر دیں گے آپ کو انبیاء اولیاء اور بزرگان دین بھی بند غاروں میں مراقبے کرتے ملیں گے یہاں تک کہ مہاتما بودھ کو نروان بھی ایک ایسے درخت کے نیچے ملا تھا جس سے آسمان دکھائی نہیں دیتا تھا وہ درخت اتنا گھنا تھا کہ وہ بارش تک روک لیتا تھا آپؐ نے فرمایا رفع حاجت کی جگہ (ٹوائلٹ) مت تھوکو۔ یہ حکم اپنے اندر دو حکمتیں رکھتا ہے ٹوائلٹ میں تھوکنے سے بعد میں آنے والوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور دوسرا ٹوائلٹس میں لاکھوں قسم کے جراثیم بھی ہوتے ہیں ہم جب تھوکنے کیلئے منہ کھولتے ہیں تو یہ جراثیم ہمارے منہ میں پہنچ جاتے ہیں یہ ہمارے لعاب دہن میں پرورش پاتے ہیں یہ معدے اور پھیپھڑوں میں پہنچتے ہیں اور پھر یہ ہمیں بیمار کر دیتے ہیں آپ کو یہ جان کر حیرانی ہو گی ہماری ناک جراثیم کو پھیپھڑوں تک نہیں جانے دیتی ہماری ناک سے صرف کیمیکلز جسم میں داخل ہوتے ہیں جراثیم زیادہ تر منہ سے بدن میں اترتے ہیں اور ان کا بڑا سورس ٹوائلٹس ہوتے ہیں چنانچہ آپ ٹوائلٹ میں لمبی لمبی سانس لینے تھوکنے گانا گانے آوازیں دینے اور موبائل فون پر بات کرنے سے پرہیز کریں آپ کی صحت اچھی رہے گی۔

آپؐ نے فرمایا لکڑی کے کوئلے سے دانت صاف نہ کرو۔ ہم میں سے بے شمار لوگ کوئلے سے دانت صاف کرتے ہیں کوئلے سے ہمارے دانت وقتی طور پر چمک جاتے ہیں لیکن یہ بعد ازاں مسوڑے بھی زخمی کر دیتا ہے دانتوں کی جڑیں بھی ہلا دیتا ہے اور یہ منہ میں بو بھی پیدا کرتا ہے لکڑی کا کوئلہ سیدھا سیدھا کاربن ڈائی آکسائیڈ ہوتا ہے یہ "ہائی جینک" بھی نہیں ہوتا چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے پرہیز کا حکم دیا۔ آپؐ نے فرمایا ہمیشہ بیٹھ کر کپڑے تبدیل کیا کرو۔ ہم میں سے اکثر لوگ شلوار پتلون یا پاجامہ پہنتے وقت اپنی ٹانگ پھنسا بیٹھتے ہیں اور گر پڑتے ہیں ہم میں سے ہر شخص زندگی میں کبھی نہ کبھی اس صورتحال کا شکار ضرور رہتا ہے بالخصوص ہم بڑھاپے میں شلوار یا پتلون بدلتے وقت ضرور گرتے ہیں آپؐ نے شاید اس قسم کے حادثوں سے بچنے کیلئے یہ حکم جاری فرمایا تھا اور آپؐ نے فرمایا اپنے دانتوں سے سخت چیز مت توڑا کرو۔ ہم لوگ اکثر بادام اخروٹ یا نیم پکا گوشت توڑنے کی کوشش میں اپنے دانت تڑا بیٹھتے ہیں دانت ایکٹو زندگی کا قیمتی ترین اثاثہ ہوتے ہیں آپؐ نے شاید اسی لئے دانتوں کو سخت چیزوں سے بچانے کا حکم دیا۔

نوٹ: یہ کامیاب صحت مند زندگی کے بارہ اصول ہیں 28 ابھی باقی ہیں یہ آپ اگلے کالم میں ملاحظہ کیجئے گا۔

رسول اللہ ﷺ کے چالیس اصول (دوسرا حصہ)

خوراک تہذیب کا تیسرا بڑا عنصر ہوتی ہے' آپ اگر کسی قوم' کسی خاندان یا کسی شخص کی تہذیب کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو آپ صرف اتنا دیکھ لیں وہ کیا کھا رہا ہے اور وہ کیسے کھا رہا ہے آپ کو مزید تحقیق کی ضرورت نہیں رہے گی' ہمارے رسولؐ کے بہترین زندگی کے چالیس اصولوں میں سات اصول صرف کھانے سے متعلق ہیں میں دو اصول پچھلے کالم میں لکھ چکا ہوں باقی پانچ یہ ہیں' آپؐ نے فرمایا گرم کھانے کو پھونک سے ٹھنڈا نہ کرو' پنکھا استعمال کر لیا کرو' یہ فرمان بھی ہائی جین پر بیس کرتا ہے' ہم جب گرم کھانے کو پھونک مارتے ہیں تو ہمارے منہ کے بیکٹیریا کھانے کو زہریلا بنا دیتے ہیں' یہ حرکت تہذیب اور شائستگی کے منافی بھی ہے۔ فرمایا کھاتے ہوئے کھانے کو سونگھا نہ کرو' کھانے کو سونگھنا بدتہذیبی بھی ہوتی ہے اور کھانے کی خوشبو ہماری ناک کے اندر موجود سونگھنے کے خلیوں اور پھیپھڑوں کی دیواروں کو بھی زخمی کر دیتی ہے' ہمیں چھینک بھی آ سکتی ہے اور یہ چھینک سارے کھانے کو برباد کر سکتی ہے۔ فرمایا اپنے کھانے پر اداس نہ ہوا کرو' ہم عموماً کھانے کی مقدار اور کوالٹی پر اداس ہو جاتے ہیں' ہم ہمیشہ کھانا کھاتے وقت دوسروں کی پلیٹ کی طرف دیکھتے ہیں' یہ عادت ہمارے اندر ناشکری پیدا کرتی ہے' ہم اگر اپنے کھانے کو اللہ کا رزق سمجھیں' اس پر شکر کریں تو ہمارے اندر برداشت بھی بڑھے گی اور صبر اور شکر کی عادت بھی ڈویلپ ہو گی' یہ عادت ہماری زندگی کو بہتر بنا دے گی۔ فرمایا منہ بھر کر نہ کھاؤ' ہمارا منہ خوراک کے ہاضمے کا آدھا کام کرتا ہے باقی آدھا کام معدہ سرانجام دیتا ہے' ہم جب منہ بھر لیتے ہیں تو زبان اور دانتوں کو اپنا کام کرنے کیلئے جگہ نہیں ملتی' ہم جلدی جلدی نگلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور یوں ہمارے معدے کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے' معدہ یہ ذمہ داری پوری نہیں کر پاتا' ہم بدہضمی کا شکار ہو جاتے ہیں' ہمارے رسولؐ ہمیشہ چھوٹا لقمہ لیتے تھے' دیر تک چباتے تھے اور آدھا معدہ بھرنے کے بعد ہاتھ کھینچ لیتے تھے' آپؐ پوری زندگی صحت مند رہے' آپؐ کے صحابہؓ نے بھی یہ عادت اپنا لی چنانچہ مدینہ کے طبیب بے روزگار ہو گئے اور وہ کھجوروں کی تجارت کرنے لگے۔ فرمایا اندھیرے میں مت کھاؤ' اس فرمان کی دو وجوہات ہیں' اندھیرے میں کھانے سے کھانے میں کیڑے مکوڑے ملنے کا خدشہ ہوتا ہے اور دوسرا روشنی کا کھانے کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے' ہمیں روشنی میں کھایا ہوا کھانا زیادہ انرجی دیتا ہے' یہ وہ واحد وجہ ہے جس کی بنا پر دنیا بھر میں ڈنر کے وقت ہال اور کمرے کی تمام لائیٹس آن کر دی جاتی ہیں' یہ ممکن نہ ہو تو میز پر موم بتیاں جلا دی جاتی ہیں' انگریز اس انتظام کو کینڈل لائیٹ ڈنر کہتے ہیں' یہ روایت ہزار دن سال سے چلی آ رہی ہے اور یہ انتہائی مفید ہے' آپؐ نے بھی روشنی میں کھانے کا حکم دے کر اس روایت کی تائید فرمائی۔

آپؐ نے فرمایا دوسروں کے عیب تلاش نہ کرو' ہم جب دوسروں میں عیب ڈھونڈتے ہیں تو ہم چغلی' غیبت اور منافقت جیسی روحانی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں' یہ بیماریاں ہمیں حسد جیسے مہلک مرض میں مبتلا کر دیتی ہیں اور یوں ہم ذہنی' جسمانی اور روحانی تینوں سطحوں پر علیل ہو جاتے ہیں چنانچہ ہم اگر صرف دوسروں میں عیب تلاش کرنا بند کر دیں تو ہم حسد' منافقت' غیبت اور چغل خوری جیسے امراض سے بچ جائیں گے' ہم صحت مند زندگی گزاریں گے۔ فرمایا اقامت اور اذان کے درمیان گفتگو نہ کیا کرو' اللہ کائنات کا سب سے بڑا بادشاہ ہے' اذان اس بادشاہ کی طرف سے بلاوا ہوتا ہے اور اقامت شرف باریابی کی اجازت چنانچہ یہ دونوں اوقات پروٹوکول ہیں' اللہ تعالیٰ کو پروٹوکول کی خلاف ورزی اچھی نہیں لگتی' ہم اگر دنیاوی بادشاہوں کے پروٹوکول کا خیال رکھتے ہیں تو پھر ہمیں دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ کے پروٹوکول کا سب سے زیادہ احترام کرنا چاہیے۔ فرمایا بیت الخلاء میں باتیں نہ کیا کرو' اس کی وجہ جراثیم ہیں' ہم پچھلے کالم میں اس کا تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں۔ ہمارے رسولؐ دوستوں کو بہت اہمیت دیا کرتے تھے لہٰذا آپؐ نے فرمایا دوستوں کے بارے میں جھوٹے قصے بیان نہ کیا کرو' دوستوں کے بارے میں جھوٹے قصوں سے دوستوں کی دل آزاری بھی ہوتی ہے اور دوست بدنام بھی ہوتے ہیں چنانچہ اس عادت بد سے پرہیز دوستی کیلئے بہت اہم ہے۔ فرمایا دوست کو دشمن نہ بناؤ' یہ فرمان نفسیات اور معاشرت دونوں کیلئے انتہائی اہم ہے' ہمارے دوست ہماری تمام کمزوریوں سے واقف ہوتے ہیں' یہ جب دشمن بنتے ہیں تو یہ دنیا کے خوفناک ترین دشمن ثابت ہوتے ہیں چنانچہ ہمیں زندگی میں کبھی کسی دوست کو دشمن بنانا چاہیے اور نہ کبھی کسی دوست کا دشمن بننا چاہیے۔ فرمایا دوستوں کے بارے میں شکوک نہ پالو' شک دوستی کیلئے زہر ہوتا ہے' ہم جب دوستوں کے بارے میں مشکوک ہوتے ہیں تو دوستی کا دھاگہ کمزور ہو جاتا ہے چنانچہ شک سے بچنا ضروری ہوتا ہے۔ فرمایا چلتے ہوئے بار بار پیچھے مڑ کر نہ دیکھو' چلتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھنا ایک نفسیاتی بیماری ہے' یہ بیماری خوفزدہ' ڈرے اور سہمے ہوئے لوگوں میں کامن ہے' ہم جب چلتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ہم اس بیماری کا ہمارے رفتار بھی آدھی رہ جاتی ہے اور ہم بلاوجہ دوسرے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ بھی کر لیتے ہیں۔ فرمایا ایڑھیاں مار کر نہ چلو' ایڑھیاں مار کر چلنا یا چلنے کے دوران دھمک یا آواز پیدا کرنا تکبر کی نشانی ہے اور تکبر مسلمانوں کو سوٹ نہیں کرتا' ہمارے پاؤں کا ہمارے دماغ کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہوتا ہے' ایڑھیاں مارنے سے ہمارے دماغ کی چولیں ہل جاتی ہیں' ہم دماغی لحاظ سے کمزور ہو جاتے ہیں' آپ کو ایڑھیاں مار کر چلنے والے جلد یا بدیر دماغی امراض کی ادویات کھاتے ملیں گے۔ فرمایا کسی کے بارے میں جھوٹ نہ بولو' جھوٹ دنیا کی سب سے بڑی معاشرتی برائی اور گناہوں کی ماں ہے' ہم اگر صرف جھوٹ بند کر دیں تو معاشرہ ہزاروں برائیوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ فرمایا ظہر کر صاف بولا کرو تا کہ دوسرے پوری طرح سمجھ جائیں' جھوٹ کے بعد غلط فہمی معاشرے کی سب سے بڑی برائی ہے' ہم جب گفتگو میں واضح نہیں ہوتے تو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ غلط فہمیاں معاشرتی بگاڑ کا باعث بنتی ہیں چنانچہ ہم جب بھی بولیں بلند' واضح اور صاف بولیں۔

آپؐ نے فرمایا اکیلے سفر نہ کیا کرو' یہ فرمان بھی حکمت سے بھرپور ہے' اکیلا آدمی خوفزدہ بھی رہتا ہے' پریشان بھی اور یہ عموماً حادثوں کا شکار بھی ہو جاتا ہے' تحقیق سے ثابت ہوا سفر کے دوران اکیلے آدمی زیادہ لٹتے ہیں' زیادہ جلدی بیمار ہوتے ہیں اور یہ زیادہ غلط فیصلے کرتے ہیں چنانچہ جب بھی سفر کریں ایک یا دو لوگوں کو ساتھ شامل رکھیں بالخصوص عورت کو کبھی اکیلے سفر نہ کرنے دیں۔ فرمایا فیصلے سے قبل مشورہ ضرور کیا کرو' انسان 16 کیمیکلز کا مجموعہ ہے' یہ کیمیکلز ہمارے موڈز طے کرتے ہیں اور یہ موڈز ہماری زندگی کے چھوٹے بڑے فیصلے کرتے ہیں' ہم جب بھی تنہا فیصلے کرتے ہیں ہم موڈز کے تابع فیصلے کرتے ہیں اور یہ عموماً غلط ہوتے ہیں چنانچہ فیصلے سے قبل مشورہ ضروری ہے اور مشورہ ہمیشہ سمجھ دار کی بجائے تجربہ کار شخص سے کرنا چاہیے' آپ کو کبھی



زیرو پوائنٹ

جاوید چودھری

www.facebook.com/javed.chaudhry

جاتی ہیں' ہم دماغی لحاظ سے کمزور ہو جاتے ہیں' آپ کو ایڑھیاں مار کر چلنے والے جلد یا بدیر دماغی امراض کی ادویات کھاتے ملیں گے۔ فرمایا کسی کے بارے میں جھوٹ نہ بولو' جھوٹ دنیا کی سب سے بڑی معاشرتی برائی اور گناہوں کی ماں ہے' ہم اگر صرف جھوٹ بند کر دیں تو معاشرہ ہزاروں برائیوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ فرمایا ظہر کر صاف بولا کرو تا کہ دوسرے پوری طرح سمجھ جائیں' جھوٹ کے بعد غلط فہمی معاشرے کی سب سے بڑی برائی ہے' ہم جب گفتگو میں واضح نہیں ہوتے تو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ غلط فہمیاں معاشرتی بگاڑ کا باعث بنتی ہیں چنانچہ ہم جب بھی بولیں بلند' واضح اور صاف بولیں۔

آپؐ نے فرمایا اکیلے سفر نہ کیا کرو' یہ فرمان بھی حکمت سے بھرپور ہے' اکیلا آدمی خوفزدہ بھی رہتا ہے' پریشان بھی اور یہ عموماً حادثوں کا شکار بھی ہو جاتا ہے' تحقیق سے ثابت ہوا سفر کے دوران اکیلے آدمی زیادہ لٹتے ہیں' زیادہ جلدی بیمار ہوتے ہیں اور یہ زیادہ غلط فیصلے کرتے ہیں چنانچہ جب بھی سفر کریں ایک یا دو لوگوں کو ساتھ شامل رکھیں بالخصوص عورت کو کبھی اکیلے سفر نہ کرنے دیں۔ فرمایا فیصلے سے قبل مشورہ ضرور کیا کرو' انسان 16 کیمیکلز کا مجموعہ ہے' یہ کیمیکلز ہمارے موڈز طے کرتے ہیں اور یہ موڈز ہماری زندگی کے چھوٹے بڑے فیصلے کرتے ہیں' ہم جب بھی تنہا فیصلے کرتے ہیں ہم موڈز کے تابع فیصلے کرتے ہیں اور یہ عموماً غلط ہوتے ہیں چنانچہ فیصلے سے قبل مشورہ ضروری ہے اور مشورہ ہمیشہ سمجھ دار کی بجائے تجربہ کار شخص سے کرنا چاہیے' آپ کو کبھی

عادت ہے' جس کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلا' میں نے پوری زندگی کسی مشہور شخص کو طبعی موت مرتے نہیں دیکھا' یہ غیر طبعی موت مرتے ہیں اور ہمیشہ بے عزتی اور ذلت وراثت میں چھوڑتے ہیں۔ فرمایا شیخی نہ بگھارو' یہ بھی کمال اصول ہے' میں نے آج تک کسی شیخی خور کو باعزت نہیں دیکھا' ہم عزت بڑھانے کیلئے شیخی مارتے ہیں اور ہمیشہ پرانی عزت بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ فرمایا گداگروں کا پیچھا نہ کیا کرو' ہم میں سے بے شمار لوگ فقیر کو دس بیس روپے دے کر یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں یہ واقعی حق دار تھا یا نہیں' یہ عادت ہمیں شکی بھی بنا دیتی ہے اور یہ صدقے اور خیرات سے بھی دور کر دیتی ہے۔ فرمایا مہمان کی کھلے دل سے خدمت کرو' یہ عادت ہماری شخصیت میں کشش پیدا کر دیتی ہے' آپ کو مہمان نوازوں میں ہمیشہ مقناطیسی کشش ملے گی' آزما کر دیکھ لیں۔ فرمایا غربت میں صبر کیا کرو' یہ فرمان بھی کیا شاندار فرمان ہے' صبر بہت بڑی دولت ہے' یہ دولت کبھی کسی انسان کو غریب نہیں رہنے دیتی' آپ صابر ہو جائیں آپ کے حالات دنوں میں بدل جائیں گے' آپ یہ بھی آزما کر دیکھ لیں۔ فرمایا اچھے کاموں میں دوسروں کی مدد کیا کرو' اچھائی نیکی ہوتی ہے اور نیکی میں دوسروں کا ساتھ دینے والے بھی جلد نیک ہو جاتے ہیں' آپ صرف نیک لوگوں کے معاون بن جائیں آپ نیکوں سے بھی آگے نکل جائیں گے۔ فرمایا اپنی خامیوں پر غور کیا کرو اور توبہ کیا کرو' تحقیق بتاتی ہے ہم اگر اپنی کسی ایک خامی پر قابو پا لیں تو ہم میں دس خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں' آپ یہ بھی آزما کر دیکھ لیں۔ فرمایا برا کرنے والوں کے ساتھ ہمیشہ نیکی کرو' یہ بھی آزما کر دیکھیں یہ عادت آپ کے دشمنوں کی تعداد کم کر دے گی۔ فرمایا اللہ نے جو دیا ہے اس پر خوش رہو' میرا تجربہ ہے ہم دوسرے پرندے کی کوشش میں ہاتھ کا پرندہ بھی اڑا بیٹھتے ہیں' ہمیں جو مل جائے ہم اگر اسے انجوائے کرنا سیکھ لیں تو یہ دنیا جنت ہو جاتی ہے۔ فرمایا زیادہ نہ سویا کرو' زیادہ نیند یاداشت کو کمزور کر دیتی ہے' یہ بھی طبی لحاظ سے درست ہے' نیند موت کی چھوٹی سطح ہے' یہ بڑھ جائے تو ہمارے برین سیل مرنے لگتے ہیں چنانچہ سات گھنٹے سے کم اور آٹھ گھنٹے سے زیادہ نیند نہیں لینی چاہیے اور چالیسواں فرمان' فرمایا روزانہ کم از کم سو بار استغفار کیا کرو' یہ عادت بھی عبادت ہے آپ کر کے دیکھیں آپ کو نتائج حیران کر دیں گے۔

ہمارے رسولؐ کے چالیس اصول مکمل ہو گئے لیکن کیا یہ اصول امت میں موجود ہیں؟ یہ ہم اگلے کالم میں ڈسکس کریں گے۔

لخ دی..... ہم سب پر

زیرو پوائنٹ
جاوید چودھری
www.facebook.com/javed.chaudhry

میں بیس برس سے مولانا رومؒ اور ابن عربیؒ کا پیچھا کر رہا ہوں' میں ابن عربیؒ کی تلاش میں دمشق تک ہو آیا' معرفت کی اس تلاش میں جنگ کی پرواہ بھی نہیں کی اور میں درجنوں مرتبہ مولانا رومؒ کے مزار پر بھی گیا' ابن عربیؒ کی کتابیں بھی کھنگال ماریں اور بیس برس سے مولانا رومؒ کی مثنوی بھی پڑھ رہا ہوں لیکن معرفت شاید میرے نصیب میں نہیں تھی چنانچہ میں آج تک اس خزانے سے محروم ہوں تاہم مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی عمران خان کی ممکنہ بیگم بشریٰ بی بی مولانا رومؒ اور ابن عربیؒ کی ماہر ہیں اور عمران خان نے ان سے نہ صرف معرفت سیکھ لی بلکہ یہ ابن عربیؒ اور مولانا رومؒ کے اصل پیغام تک بھی پہنچ گئے' میں مولانا رومؒ اور ابن عربیؒ کو نہیں سمجھ سکا' میں ان کے اصل پیغام تک نہیں پہنچ سکا اور میں پوری کوشش اور تپسیا کے باوجود معرفت کی م کو بھی نہیں سمجھ سکا لیکن اس کے باوجود میرا سفر رائیگاں نہیں جائے گا' میں اب دنیا سے خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا' کیوں؟ کیونکہ میں روزانہ کھلی آنکھوں سے ایک ایسے شخص کا دیدار کرتا ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت سے بھی نوازہ اور جو اس زمانے میں ابن عربیؒ اور مولانا رومؒ دونوں کا ماہر بھی ہے اور ان شاء اللہ معرفت ان کے گھر میں بھی آباد ہو گی اور وہ معرفت بنی گالہ سے اپنی کرنیں پورے ملک میں پھیلائے گی اور یوں پورا پاکستان معرفت سے روشن ہو جائے گا۔

دنیا نے آج تک ابن عربیؒ اور مولانا رومؒ سے بڑا دانشور اور صوفی پیدا نہیں کیا' ابن عربیؒ تصوف کا سلسلیس ہیں' مولانا رومؒ صوفیاء کے استاد اور ''محبت'' دونوں کی یونیورسٹی' یہ دونوں محبت کو معرفت سمجھتے تھے' مولانا رومؒ نے فرمایا'' ہم انسان محبت کی پیداوار ہیں' محبت ہماری ماں ہے''۔ فرمایا'' سچائی کے بے شمار راستے ہیں مگر میں نے اپنے لئے محبت کا راستہ چنا''۔ فرمایا'' تم اگر عظمت کی بلندیوں کو چھونا چاہتے ہو تو اپنے دل میں انسانیت کیلئے محبت آباد کر لو''۔ فرمایا'' تمہاری اصل ہستی تمہاری سوچ ہے باقی تو صرف ہڈیاں اور خالی گوشت ہے''۔ فرمایا'' اپنی آواز کی بجائے اپنے دلائل کو بلند کرو' پھول بادل کے گرجنے سے نہیں اگتے' برسنے سے اگتے ہیں''۔ فرمایا'' جاؤ پہلے خود کو ڈھونڈو تا کہ تم مجھے پا سکو''۔ فرمایا '' تھوڑی دیر کیلئے قبرستان جاؤ اور خاموشی سے بیٹھ اور ان بولنے والوں کی خاموشی کو دیکھ''۔ فرمایا'' غم نہ کرو' تم جو کھو رہے ہو وہ کسی اور شکل میں تم تک واپس آئے گا''۔ فرمایا '' میں نے ایسے بے شمار انسان دیکھے جن کے بدن پر لباس نہیں تھا اور میں نے بے شمار ایسے لباس بھی دیکھے جن کے اندر انسان نہیں تھے'' اور فرمایا'' میں پہلے پہل اس کی تلاش میں تھا' اب وہ مجھ میں ہے اور میں کھو گیا ہوں''۔ یہ وہ معرفت تھی جس کی تلقین مولانا رومؒ پوری زندگی کرتے رہے' ابن عربیؒ نے بھی محبت کو'' ڈی کوڈ'' کیا اور وہ بھی معرفت تک پہنچ گئے' ابن عربیؒ معرفت کو پہچان کہتے تھے' وہ فرمایا کرتے تھے اپنے آپ کو پہچاننا اور پھر اللہ کی پہچان یہ معرفت ہوتی ہے' مولانا وحید الدین معرفت کو ادراک یعنی سیلف ریلائزیشن (Self Realisation) اور شعوری دریافت (Intellectual Discovery) کہتے ہیں' یہ سمجھتے ہیں زندگی معرفت کا آغاز اور موت معرفت کی تکمیل ہے' ابن عربیؒ معرفت کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں' پہلی قسم معرفت رویت ہے' یہ صرف پیغمبروں کو نصیب ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے انہیں اپنی معرفت نصیب کرتا ہے' دوسری قسم عاجزی ہے' انسان اگر یہ سمجھ لے میں اس کائنات کی عاجز ترین مخلوق ہوں' میں کچھ نہیں ہوں' یہ کوئی اور ہے میں جس کی پتلی بن کر زندگی گزار رہا ہوں تو یہ معرفت کی دوسری قسم کو پا لیتا ہے' حضرت علیؓ نے اس دوسری قسم کو اس طرح واضح کیا'' میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا'' ہم انسان کام کرنے اور کام کو انجام تک پہنچانے میں ناقص ہیں' ہم میں سے کوئی نہیں جانتا ہم فصل بونے کے بعد فصل کاٹ بھی سکیں گے تاہم ہم فصل بونے کا ارادہ ضرور کر سکتے ہیں' حضرت علیؓ نے یہ فرما کر'' میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے اپنے رب کو شناخت کیا'' یہ مہر لگا دی ہم انسان اس قدر حقیر ہیں کہ ہماری کیا مجال ہے ہم اپنے ارادوں پر بھی قائم رہ سکیں' عاجزی کی یہ آگاہی معرفت کی دوسری قسم ہوتی ہے اور تیسری قسم معرفت اختیاری کہلاتی ہے' ہم بحیثیت انسان کیا کیا اختیارات رکھتے ہیں' ہم کیا کیا کر سکتے ہیں' یہ آگاہی معرفت کی تیسری قسم ہے' صوفیاء کرام معرفت اختیاری اور معرفت مجز کے ماہر ہوتے تھے' یہ ان دونوں دائروں کے درمیان رہ کر کائنات کے تمام رموز جان جاتے تھے' ابن عربیؒ اور مولانا رومؒ کا خیال تھا معرفت کے ان دونوں دروازوں کی صرف ایک چابی ہے اور اس چابی کا نام محبت ہے' آپ کے ہاتھ میں اگر محبت کی چابی ہے تو آپ معرفت کے یہ دونوں دروازے کھول لیں گے ورنہ دوسری صورت میں آپ پوری زندگی بھٹکتے رہیں گے لیکن آپ اندر داخل نہیں ہو سکیں گے۔

ہمارے رسولؐ معرفت کے پرنسپل تھے' آپؐ سے ایک صحابیؓ نے عرض کیا' یا رسول اللہ ﷺ کون سا عمل افضل ہے' جواب دیا' اللہ کی معرفت' عرض کیا' میں عمل دریافت کر رہا ہوں لیکن آپؐ علم کی تلقین کر رہے ہیں' فرمایا' علم کے ساتھ تھوڑا سا عمل بہت زیادہ نفع دیتا ہے اور جہالت کے ساتھ بہت سا عمل بہت نقصان پہنچاتا ہے' میں نے اس حدیث سے سیکھا آپ عمل سے پہلے اس کام سے متعلق علم حاصل کر لیں' آپ کم محنت میں زیادہ پھل پا لیں گے اور آپ کے پاس اگر علم نہیں تو آپ جتنا چاہیں عمل کریں آپ کے خسارے میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور مولانا رومؒ اور ابن عربیؒ کا معرفت کے بارے میں علم محبت پر مبنی تھا' یہ جان گئے تھے محبت اللہ کی معرفت کی کنجی ہے' یہ جان گئے تھے ہم اپنے دل کی کدورت جتنی کم کرتے جائیں گے ہمارا دل اتنا محبت کے نور سے روشن ہوتا جائے گا' ہم اتنے اللہ کی معرفت کے قریب ہوتے جائیں گے' اللہ کی ذات معرفت ہے اور اللہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے' یہ بدبخت ترین لوگوں کے عیبوں پر بھی پردہ ڈالے رکھتا ہے' ابن عربیؒ کے پاس دمشق کا ظالم ترین شخص آیا' ابن عربیؒ نے اسے محبت کے ساتھ اپنے پہلو میں بٹھا لیا' شاگردوں نے اعتراض کیا' آپ نے جواب دیا یہ اپنے تمام مظالم کے باوجود اللہ کی پکڑ سے محفوظ ہے' اللہ آج بھی اس سے مایوس نہیں ہوا' میں اس سے نفرت کر کے اپنے اللہ کو کیوں ناراض کر لوں' ابن عربیؒ نے معرفت کے راستے پر چلنے والوں کی چند نشانیاں بھی بیان کی ہیں' آپؒ فرماتے ہیں انسان جب معرفت کو سمجھ جاتا ہے تو یہ سنجیدہ ہو جاتا ہے' یہ دنیا کی ہر چیز کو عارفانہ نظروں سے دیکھتا ہے' یہ شدت کے ساتھ اپنی ذات کا محاسبہ کرتا ہے' یہ اپنی ذات میں چھپے کتے ایک ایک کر کے باہر نکال دیتا ہے' یہ عبادات کا لباس پہن لیتا ہے' یہ جلوت ہو یا خلوت یہ اللہ کی ذات کے ساتھ جڑا رہتا ہے' یہ اللہ کی ذات کے علاوہ کسی کو اپنی زبان پر نہیں لاتا' یہ اخلاق اور معاملات میں شریعت بن جاتا ہے' پوری دنیا میں کوئی شخص اس کی بدزبانی کا گواہ نہیں ہوتا' یہ وعدہ نہیں توڑتا' یہ معاملات طے کر کے منحرف نہیں ہوتا اور یہ معرفت کے ماحول میں جیتا اور معرفت کے ماحول میں مرتا ہے' یہ معرفت کی ہواؤں میں سانس لیتا ہے جبکہ مولانا رومؒ معرفت پانے والوں کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں' عارف کا دل انسانیت کی محبت سے آباد ہو جاتا ہے' عارف خالی گوشت اور کھوکھلی ہڈیوں سے بالاتر ہو کر سوچ بن جاتے ہیں' یہ محبت کو ماں سمجھتے ہیں' یہ انسانیت کو اپنا لباس بنا لیتے ہیں' یہ کھو جانے اور چھن جانے پر غم زدہ نہیں ہوتے' یہ خود کو ڈھونڈ لیتے ہیں' یہ خود کو پا لیتے ہیں' یہ اپنی آواز کو پست اور دلائل کو بلند کر لیتے ہیں اور یہ فرشتوں کے ہم نشین ہو جاتے ہیں اور یہ اکثر اوقات قبرستان میں بیٹھ کر مُردوں کی خاموشی کی آواز سنتے ہیں۔

میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں میں ایک ایسے دور میں زندہ ہوں جس میں ایک جیتا جاگتا عارف موجود ہے اور میں روزانہ کھلی آنکھوں سے معرفت کے راستے پر سرپٹ بھاگتے اس عظیم عارف کو دیکھتا ہوں' میں اپنی آنکھوں سے مولانا رومؒ اور ابن عربیؒ کے عارف کو دیکھتا ہوں' اللہ تعالیٰ عمران خان کا سایہ ہم سب کے سروں پر سلامت رکھے' یہ پاکستان کی ستر سالہ تاریخ کے پہلے صوفی سیاستدان ہیں' یہ ابن عربیؒ اور مولانا رومؒ کے آئیڈیل عارف ہیں' یہ ان شاء اللہ معرفت کے ساتھ اقتدار کے ایوانوں میں پہنچنے والے پہلے وزیراعظم بھی بنیں گے' مجھے یقین ہے اللہ تعالیٰ نے اگر اتنی نوازشات فرمائی ہیں تو یہ میری گناہگار نظروں کو وہ وقت دیکھنے کی مہلت بھی ضرور عطا کرے گا جب پاکستان معرفت کی خوشبو میں لپٹا ہو گا اور ہم سب اپنی گناہگار نظروں سے ابن عربیؒ اور مولانا رومؒ کے عارف کو کرسی اقتدار پر جلوہ افروز دیکھیں گے' باقی رہ گئی لعنت تو صوفیاء کرام جذب و مستی میں دیر و کعبہ کو کیا کیا نہیں کہتے رہے' یہ تو پھر بھی حقیر سی پارلیمنٹ ہے' کیا قوم عارف لیڈر کی اتنی سی معرفت بھی برداشت نہیں کر سکتی؟ اگر نہیں تو پھر لخ دی..... ہم سب پر!۔

روزنامہ ایکسپریس گوجرانوالہ جمعۃ المبارک 19 جنوری 2018ء

روزنامہ کے پی لائن، گوجرانوالہ، اتوار، 21 جنوری 2018ء

آئیڈیل انسان



زیرو پوائنٹ

جاوید چودھری

www.facebook.com/javed.chaudhry

دکاندار ہمارے سامنے بچھ گیا' گودام سے صاف کرسیاں منگوائیں' چائے کیلئے ملازم دوڑایا اور بیٹر کھینچ کر ہماری ٹانگوں کے نزدیک کر دیا' وہ بار بار کانوں کو ہاتھ لگاتا تھا' چہرے کی طرف دیکھتا تھا اور لجاجت کے ساتھ کہتا تھا' بٹ صاحب! یہ سب آپ کی مہربانی ہے' اللہ تعالیٰ اگر مجھے آپ جیسے گاہک نہ دیتا تو میں آج اپنے بچوں کو عزت کے ساتھ روزی نہ کھلا رہا ہوتا' وہ اس کے بعد میری طرف مڑتا اور سرگوشی میں کہتا' آپ بڑے خوش نصیب ہیں' رب نے آپ کو بٹ صاحب جیسا دوست دیا' ایسے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں' یہ نفسا نفسی کا زمانہ ہے' لوگ لوگوں کا گلا کاٹ رہے ہیں' ملک میں بس ان جیسے چند لوگ بچے ہیں' اللہ ان کا سایہ ہم پر سلامت رکھے' وہ چائے آنے تک ان فقروں کی گردان کرتا رہا' چائے آ گئی تو وہ ہماری طرف متوجہ ہوا اور عاجزی کے ساتھ عرض کیا" جی حضور فرمایئے کیسے آنا ہوا" میرے دوست نے جیب سے فہرست نکالی اور اس کے حوالے کر دی' دکاندار نے ملازم کو آواز دی اور سودا نکالنے کا حکم دے دیا' ہم چائے پیتے رہے اور ملازم سودا باندھتے رہے' ملازمین نے اس کے بعد گاڑی کی چابی لی اور سودا گاڑی کی ڈکی میں رکھ دیا' میرے دوست نے بل مانگا' دکاندار نے شرما کر عرض کیا" بٹ صاحب رہنے دیں' آپ دکان کے مالک ہیں' ہم مالک سے پیسے کیسے لے سکتے ہیں" لیکن بٹ صاحب نے اصرار کرنا شروع کر دیا' دکاندار نے مجبور ہو کر ملازم سے بل منگوایا' اپنے ہاتھ سے رعایت کی اور شرما کر بولا' آپ اگر رہنے دیتے تو اچھا تھا لیکن آپ ضد کر رہے ہیں تو میں لے لیتا ہوں' دکاندار نے اس کے بعد بل میرے دوست کو پکڑا دیا' دوست نے بل پر نظر ڈالی' جیب سے رقم نکالی اور دکاندار کے حوالے کر دی' ہم نے اجازت لی' دکاندار ہمیں گاڑی تک چھوڑنے آیا اور ہم جب تک بازار سے باہر نہ نکل گئے وہ ہاتھ ہلاتا رہا۔

میں اپنے دوست کی عزت افزائی پر دل ہی دل میں حسد کرنے لگا' میں خود بھی برسوں کا گاہک ہوں لیکن مجھے آج تک کسی دکاندار نے اتنی عزت نہیں دی' میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے دوست سے کہا" بٹ صاحب ماشاء اللہ پورا شہر آپ کی عزت کرتا ہے" بٹ صاحب نے پورا منہ کھول کر قہقہہ لگایا اور بولے" تم اس کی وجہ جانتے ہو" میں نے کسمسا کر جواب دیا" آپ با اخلاق اور مہربان ہیں" بٹ صاحب نے مزید اونچا قہقہہ لگایا اور بولے ہرگز ہرگز نہیں' اس دکاندار کی زندگی میں مجھ سے بڑے بے شمار مہربان اور با اخلاق لوگ ہیں لیکن یہ عزت صرف میری کرتا ہے" وہ خاموش ہو گئے' میں حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا' وہ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر بولے" میری اس تمام تر عزت کی وجہ میری بے وقوفی ہے' میں ایک بے وقوف گاہک ہوں چنانچہ شہر کا ہر دکاندار میری عزت کرتا ہے" میری حیرت میں اضافہ ہو گیا' وہ بولے" ہمارے ملک میں صرف بے وقوفوں کی عزت ہوتی ہے' آپ جتنا سمجھ دار ہوتے جاتے ہیں' آپ کی عزت اور رشتے اتنے ہی کم ہوتے جاتے ہیں' آپ اتنے ہی اکیلے ہوتے جاتے ہیں" مجھے بٹ صاحب کی بات سمجھ نہ آئی چنانچہ میں چپ چاپ ان کی طرف دیکھتا رہا' وہ بولے" دکاندار کی نظر میں وہ شخص بہترین گاہک ہوتا ہے جو بھاؤ تاؤ نہ کرے' جو چیز کا ریٹ نہ پوچھے' جو کوالٹی چیک نہ کرے' جو وزن کی پڑتال نہ کرے اور جو آنکھیں بند کر کے ایک ہی دکاندار سے سودا خریدتا رہے' دکاندار اسے جو باندھ دے' یہ چپ چاپ لے جائے' چیز خراب بھی نکل آئے تو یہ اعتراض نہ کرے اور میں ایک ایسا آئیڈیل گاہک ہوں چنانچہ یہ لوگ میری عزت کرتے ہیں"۔ وہ رکے اور پھر بولے" اور گاہک کی نظر میں کون سا دکاندار آئیڈیل ہوتا ہے؟ وہ دکاندار جو گاہک کو ادھار دے دے' جو پیسوں کا مطالبہ نہ کرے' جس کے ریٹس پورے بازار میں کم ہوں' جو کلو گرام کے پیسے لے کر ڈیڑھ کلو چیز تول دے' ہم جسے استعمال کے بعد جو بھی چیز واپس کریں وہ چپ چاپ رکھ لے اور ہم جس کی دکان میں گھس کر جو چاہیں اٹھا لے جائیں اور وہ اعتراض نہ کرے ہم اس کو شاندار دکاندار کہیں گے' ہم دل سے اس کی عزت کریں گے" بٹ صاحب رکے اور پھر گویا ہوئے" دکاندار پوری زندگی بے وقوف گاہک تلاش کرتے رہتے ہیں اور گاہک تمام عمر بے وقوف دکاندار اور میں یہ حقیقت جان گیا میں پانچ وقتہ بے وقوف بن گیا ہوں' میں چپ چاپ نقصان برداشت کر جاتا ہوں چنانچہ میری زندگی میں شامل ہر شخص میری عزت کرتا ہے' یہ مجھ سے محبت کرتا ہے"۔ بٹ صاحب خاموش ہو گئے۔

یہ واقعہ گزرے کئی سال ہو چکے ہیں لیکن میں بٹ صاحب کا فلسفہ نہیں بھول سکا' مجھے شروع میں یہ فلسفہ بے ڈھنگا اور عجیب محسوس ہوتا تھا' میں بٹ صاحب کو احمق ترین شخص سمجھتا تھا لیکن پھر میں آہستہ آہستہ ان کی دانائی کا قائل ہو گیا' ہم سب پوری زندگی بے وقوفوں کی تلاش میں رہتے ہیں' ہمیں جوں ہی کوئی بے وقوف مل جاتا ہے ہم آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرتے ہیں' اسے اونچی کرسی پیش کرتے ہیں اور جی جان سے اس کی خدمت اور عزت کرتے ہیں' آپ اپنے دائیں بائیں دیکھ لیں' آپ کو لوگ جن کی عزت کرتے نظر آئیں گے آپ کو ان میں صرف ایک خوبی نظر آئے گی اور وہ خوبی ہو گی بے وقوفی۔ وہ لوگ کسر کھا جاتے ہوں گے' نقصان برداشت کر جاتے ہوں گے چنانچہ وہ سب کی نظروں میں محبوب ہوں گے جبکہ اپنے مفاد کا خیال رکھنے' حساب لینے اور جمع تفریق کرنے والے لوگ سب کی نظروں میں چبھتے ہیں' یہ برداشت نہیں ہوتے' یہ اکیلے ہوتے ہیں۔ میرے ایک جاننے والے یورپ میں رہتے تھے' وہ پورے خاندان' دوست احباب اور عزیز رشتے داروں میں مقبول تھے' وہ بڑے بھائی جان کے نام سے مشہور تھے' وہ پاکستان آتے تھے تو آدھا شہر انہیں لینے کیلئے ایئر پورٹ جاتا تھا' رشتے دار انہیں پھولوں سے لاد دیتے تھے' وہ مہینہ پاکستان رہتے تھے' مہینہ بھر ان کی دعوتیں چلتی تھیں لیکن پھر وہ اچانک بڑے بھائی جان نہ رہے' لوگوں نے ان سے منہ موڑ لیا' وہ پاکستان آتے تھے تو ائیر پورٹ سے اکیلے گھر آتے تھے' وہ چھٹیوں کے دوران اکیلے پھرتے رہتے تھے اور پھر چپ چاپ واپس چلے جاتے تھے' میں نے ایک دن ان سے اس کایا کلپ کی وجہ پوچھی' بڑے بھائی جان نے قہقہہ لگا کر جواب دیا' میں جعلی کریڈٹ کارڈ بناتا تھا' میرے پاس لاکھوں پاؤنڈز ہوتے تھے' مجھ سے میرے عزیز رشتے دار اور دوست جتنے پیسے مانگتے تھے' میں بھجوا دیتا تھا لیکن پھر میرا کام بند ہو گیا' میں محنت مزدوری پر مجبور ہو گیا' یہ لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں تھے' یہ مجھ سے پرانی روٹین کے مطابق پیسے مانگتے تھے' میں معذرت کر لیتا تھا' یہ ایمینڈ کر جاتے تھے یوں ہم میں فاصلہ پیدا ہو گیا' میرے حالات مزید خراب ہو گئے اور میں نے اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ادھار مانگنا شروع کر دیا' میری یہ جسارت انہیں پسند نہ آئی چنانچہ یہ بھاگ گئے' بڑے بھائی جان نے اس کے بعد یہ تاریخی فقرہ کہا" آپ جب تک اپنا ہاتھ کھلا رکھیں گے لوگ آپ کو ان داتا کہتے رہیں گے لیکن آپ نے جوں ہی ہاتھ کو مٹھی بنا لیا وہی لوگ آپ پر مٹی ڈال دیں گے"۔ میرے ایک اور دوست بھی لوگوں میں بہت مقبول ہیں' یہ جہاں جاتے ہیں لوگ کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے ہیں' میں نے ان سے وجہ پوچھی' یہ بھی قہقہہ لگا کر بولے" یہ تمام لوگ میری رقمیں کھا کر بیٹھے ہیں' یہ ادھار خور ہیں' میں ان سے رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرتا چنانچہ یہ مجھے جہاں ملتے ہیں یہ فوراً نکالنا شروع کر دیتے ہیں"۔ میں نے ان سے پوچھا" آپ ان سے اپنا ادھار واپس کیوں نہیں لیتے" وہ ہنس کر بولے" یہ عزت ان پیسوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے' میں نے جس دن پیسے مانگ لئے اس دن میری عزت ختم ہو جائے گی"۔

یہ بات غلط نہیں تھی' ہم لوگ واقعی بے وقوفوں اور ناسمجھوں کو پسند کرتے ہیں' وہ لوگ جو اپنا سب کچھ دوسروں کیلئے وقف کر دیں' آپ جنہیں جی بھر کر لوٹ سکیں اور آپ ان سے جو مانگیں وہ نکال کر دے دیں لیکن جو شخص حساب مانگ لے' جو اپنے مفاد کا خیال رکھے' جو پرائس ٹیگ پڑھے' جو ادائیگی سے پہلے بل چیک کرے اور جو خریداری کے بعد پراڈکٹس کی شکایت کرے وہ لوگ ہمیں برے لگتے ہیں' ہم ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے' ہماری نظر میں وہ دوست جگری دوست ہوتا ہے جو ہم پر تن' من اور دھن وار دے اور اس کے جواب میں ہم سے کچھ طلب نہ کرے' ہمیں والدین بھی ایسے چاہئیں جو کبھی انکار نہ کریں' ہم جو مانگ لیں وہ دے دیں اور کبھی حساب نہ کریں' ہمیں صرف وہ بھائی سگا محسوس ہوتا ہے جو اپنا سب کچھ ہم پر قربان کر دیتا ہے' دکاندار کی نظر میں اندھا اعتماد کرنے والا گاہک اچھا اور گاہک کی نظر میں اندھا دکاندار آئیڈیل ہوتا ہے' پیر ان مریدوں کو زیادہ سچا مرید سمجھتا ہے جو گالی دینے پر بھی سبحان اللہ' سبحان اللہ کا ورد کرتے ہیں اور مرید بھی اس پیر کو کامل سمجھتے ہیں جو بلا مانگے سب کچھ دے دیتا ہے اور جواب میں مرید سے کچھ نہیں مانگتا' ہمیں حکومت بھی ایسی چاہیے جو ہمیں گھر بیٹھے سب کچھ دے دے اور ہمیں جواب میں اسے کچھ ادا نہ کرنا پڑے' ہمیں خدا بھی ایسا چاہیے جو ہمیں بے حساب دے اور جواب میں ہمیں اسے ایک سجدہ بھی نہ کرنا پڑے چنانچہ آپ اگر عزت کمانا چاہتے ہیں' آپ بٹ صاحب کہلانا چاہتے ہیں' آپ چاہتے ہیں لوگ آپ کا انتظار کریں' لوگ آپ کے سامنے بچھ جائیں' یہ آپ کو اپنا سگا سمجھیں تو آپ بے وقوف بن جائیں' آپ اپنے دونوں ہاتھ صرف اور صرف دینے کیلئے وقف کر دیں' آپ اچھے دکاندار' اچھے گاہک بن جائیں' لوگ آپ کے پاؤں چھوئیں گے' آپ آئیڈیل انسان ہو جائیں گے۔

دال دلیا

تازہ موصولات

صحیفہ: مجلس ترقی ادب کا جریدہ جسے ڈاکٹر تحسین فراقی ایڈٹ کرتے ہیں' یہ اس کا خصوصی شمارہ مکاتیب نمبر حصہ دوم ہے' ضخامت 800 صفحات' قیمت 580 روپے۔ کلاسیک سے لے کر اب تک کے نامور ادیبوں کے مکاتیب شامل کئے گئے ہیں جو صرف مکاتیب ہی نہیں بلکہ پوری ادبی تاریخ بیان کر دی گئی ہے۔ بیحد قابل مطالعہ اور ایک تحفہ اور یادگار مجموعہ۔

اجمال: کراچی سے فہیم اسلام انصاری شائع کرتے ہیں جو ادب کی نمائندہ روایات کا ترجمان ہے صفحات 240 اور قیمت پانچ سو روپے ہے' یہ کتاب نمبر 13 ہے۔ لکھنے والوں میں ڈاکٹر ضیاء الحسن' اقتدار جاوید' اکبر معصوم' احمد صغیر صدیقی' حمیدہ شاہین نمایاں ہیں۔ ''ماضی سے'' کے عنوان سے بھگوان داس' جون ایلیا' عبیداللہ علیم اور اوپندر ناتھ اشک کی تحریریں شامل ہیں۔

تفہیم: جموں کشمیر سے عمر فرحت نکالتے ہیں۔ موجودہ شمارہ نیئر مسعود کے نام ہے۔ ماہانہ قیمت 500 روپے۔ سرپرست شمس الرحمٰن فاروقی اور اعزازی مدیر لیاقت جعفری ہیں۔ مضامین میں شمس الرحمٰن فاروقی' عتیق اللہ' قاضی افضال حسین' مرزا حامد بیگ' ندیم احمد' قاضی افضال حسین اور محمد حمید شاہد نمایاں ہیں' منظومات میں بھی ممتاز اور اہم نام ہیں۔

استفسار: کتابی سلسلہ جے پور بھارت سے شین کاف نظام اور عادل رضا منصوری شائع کرتے ہیں۔ قلم کاروں میں عتیق اللہ' آصف فرخی' سلیم شہزاد' ستیہ پال آنند' جمیل الرحمٰن' جینت پرمار' سید تحسین گیلانی' اقتدار جاوید' عمر فرحت' مرزا حامد بیگ' پرتپال سنگھ بیتاب' محمد حامد سراج' غلام مرتضیٰ راہی' سعادت سعید اور احمد سہیل نمایاں ہیں۔

استعارہ: سہ ماہی جسے لاہور سے ڈاکٹر امجد طفیل اور ریاظ احمد نے شائع کیا ہے' قیمت 400 روپے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا انٹرویو' دیگر قلم کاروں میں رشید امجد' طاہر اسلم گورا' محمود شام' احسان اکبر' اشرف جاوید' عباس تابش' محسن شکیل' زاہد مسعود' سعید احمد' انوار فطرت' شمیم حنفی' ڈاکٹر سعادت سعید' غلام حسین ساجد' سلمیٰ اعوان اور محمد عاصم بٹ نمایاں ہیں۔

پیلوں: ملتان سے ڈاکٹر انوار احمد' سید عابد سہیل نکالتے ہیں۔ موجودہ شمارہ 20 ہے۔ اس کی اشاعت کے پانچ سال مکمل ہو چکے ہیں۔ اردو' پنجابی اور سرائیکی تحریروں پر مشتمل لکھنے والوں میں ڈاکٹر سلیم اختر' ڈاکٹر ناصر عباس نیر' طارق محمود' احمد سلیم' زاہد حسن ہیں۔ اس میں ہریانوی زبان کا ادب بھی شامل ہے۔ صفحات 300 اور قیمت 200 روپے رکھی گئی ہے۔

فن زاد: کتابی سلسلہ جسے بھیرہ سے یوسف چوہان شائع کرتے ہیں' یہ شمارہ 150 ہے قلم کاروں میں ستیہ پال آنند' نسیم سحر' امجد بابر' افضال نوید' خالد سردار' ڈاکٹر محمد افتخار شفیع' ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ' خاور اعجاز نمایاں ہیں۔ تراجم اور ڈرامہ بھی شامل۔ قیمت درج نہیں۔

ثبات: شعبہ اُردو علامہ اقبال یونیورسٹی کا میگزین ہے جسے ارشد محمود ناشاد نے ایڈٹ کیا ہے۔ صفحات 270 قیمت درج نہیں۔ قلم کاروں میں سعود عثمانی' افتخار عارف' توصیف تبسم' رشید امجد' شاہین عباس' علی اکبر ناطق' خورشید رضوی' محمد اظہار الحق' صابر ظفر' غلام حسین ساجد' عابد سیال' پرویز ساحر' عمران عامی' افتخار شفیع' ستیہ پال آنند' نصیر احمد ناصر' علی محمد فرشی' انجم سلیمی' قاسم یعقوب' علی اکبر ناطق' محمد حمید شاہد' نجیب عارف نمایاں ہیں۔

ماہنامہ بک ڈائجسٹ: لاہور سے اظہر سلیم مجوکہ اور ناصر بشیر شائع کرتے ہیں' صفحات 352 اور قیمت 400 روپے ہے۔ لکھنے والوں میں حسن عباسی' سلیم کوثر' سحر انصاری' ناصر عباس نیر' سعود عثمانی'



اشرف جاوید' اظہر فراغ' اعتبار ساجد' افضال نوید' باقی احمد پوری' جاوید قاسم' حسن عباس رضا' جواز جعفری' مرزا حامد بیگ' شاہدہ دلاور شاہ' خالد فتح محمد اور نازاوکاڑوی نمایاں ہیں۔

فانوس: محمد شکور طفیل لاہور سے نکالتے ہیں۔ موجودہ شمارہ سفرنامہ نمبر ہے اور قیمت 300 روپے ہے۔ یونانی سیاحوں کے سفرناموں کا ترجمہ ملک راج شرمانے کیا ہے۔ مولانا عبدالمجید سالک کے قلم سے سیاحوں کی کہانیاں ہیں۔ سفرناموں میں مارکوپولو کا سفر' ہندوستان کا بحری راستہ' بحرالکاہل کا پہلا سفر' آسٹریلیا کی دریافت' شمال مغربی امریکہ کی دریافت' دریائے نیل کے منبع کی دریافت وغیرہ۔

نعت رنگ: نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ ہے جسے سید صبیح الدین رحمانی مرتب کرتے ہیں۔ شمارہ ڈاکٹر تحسین فراقی' مبین مرزا اور ڈاکٹر ناصر عباس نیئر کے نام ہے۔ ضخامت 525 صفحات' قیمت 500 روپے ہے۔ لکھنے والوں میں ڈاکٹر ریاض مجید' سلیم شہزاد' ڈاکٹر اردو رہبر' ڈاکٹر تحسین فراقی' فتح محمد ملک' قاسم یعقوب' مضامین کے علاوہ سحر انصاری کا انٹرویو عنبرین حسیب عنبر نے لیا ہے۔

ماہنامہ سپوٹنگ لاہور: اسے لاہور سے آغا امیر حسین شائع کرتے ہیں۔ مجلس مشاورت میں شاہد حامد سابق گورنر پنجاب' جسٹس سید افضل حیدر' ناصر زیدی' طاہر منصور فاروقی' پروفیسر عطیہ سید' شاہد ضیائی' زبیر خالد' اور مرزا رفیق شامل ہیں۔ موجودہ شمارہ ممتاز مصنف آغا گل کے ایک ناول افسانہ جنات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ حسب معمول آغا صاحب کے شذرات ہیں۔ قیمت 50 روپے۔

غنیمت: کتابی سلسلہ جسے ڈاکٹر اصغر علی بلوچ کراچی سے شائع کرتے ہیں۔ لکھنے والوں میں سہیل غازی پوری' سید ریاض حسین زیدی' ناصر زیدی' شاعر علی شاعر' سید تابش الوری' جاذب قریشی' ناصر زیدی' افتخار شفیع' بسمل صابری' قاسم جلالی' گل بخشالوی' فہیم شناس کاظمی اور نازاوکاڑوی نمایاں ہیں۔

ادب دوست: لاہور سے خالد تاج شائع کرتے ہیں۔ ٹائٹل پر بانی اے جی جوش کی تصویر ہے۔ لکھنے والوں میں جلیل عالی' شوکت علی شاہ' سلیم کوثر' اشفاق احمد' منظور حسین یاد' لیاقت علی عاصم' ناصر زیدی' کرامت بخاری' مسعود احمد' افتخار شفیع' ناصر علی' محمود احمد قاضی' نوید صادق' حسین احمد شیرازی' رومانہ رومی اور پروفیسر صدیق شاہد شامل ہیں۔ مدیر اعزازی ارشد نعیم اور قیمت 20 روپے۔

ماہنامہ نیرنگ خیال: راولپنڈی سے سلطان رشک شائع کرتے ہیں۔ زیر نظر شمارہ 12 ہے۔ قیمت سو روپے ہے' اندرون سرورق غالب کی تصویر ہے۔ ٹائٹل دیدہ زیب' لکھنے والوں میں خورشید بیگ میلسوی' ڈاکٹر سکندر حیات میکن' جمیل حیات' جمیل یوسف' ڈاکٹر غلام شبیر رانا' خورشید ربانی' محمود الحسن' شوکت کاظمی' جان کاشمیری' ناصر زیدی' کرامت بخاری نمایاں ہیں۔

ماہنامہ شاداب: لاہور سے ڈاکٹر کنول فیروز شائع کرتے ہیں۔ زرسالانہ 600 روپے ہے۔ لکھنے والوں میں خاکسار' ناصر زیدی' حسن عسکری کاظمی' سہیل غازی پوری' ڈاکٹر سید اقبال سعدی' سید قاسم جلال' یونس صابر' سید فراست علی بخاری' ڈاکٹر کنول فیروز' الطاف نسیم' پروفیسر شاہ محمد سبطین شاہجہانی' الطاف نسیم اور ڈاکٹر یوسف مسیح شاد شامل ہیں۔

الحمراء: لاہور جسے شاہد علی خاں شائع کرتے ہیں' سالنامہ ہے' قیمت 500 روپے ہے۔ لکھنے والوں میں فتح محمد ملک' محمد اکرام چغتائی' پروفیسر حمید احمد خاں' عبدالمجید سالک' اظہر جاوید' ستیہ پال آنند' اصغر ندیم سید' جمیل یوسف' رؤف خیر' قیصر نجفی' بشریٰ رحمٰن' افسر ساجد' اسلم کمال' سلمیٰ اعوان' نیلم احمد بشیر' عباس رضوی' مظفر بخاری' جوگندر پال اور پروفیسر حسن عسکری کاظمی نمایاں ہیں۔

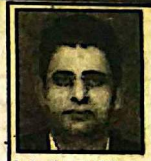
ادب عالیہ: کراچی سے حجاب عباسی شائع کرتی ہیں۔ صفحات 300 اور قیمت 500 روپے۔ لکھنے والوں میں نیلم احمد بشیر' غلام شبیر رانا' فہیم شناس' پیرزادہ قاسم' عرفان ستار' گلزار' ستیہ پال آنند' مستنصر حسین تارڑ' مشرف عالم ذوقی' سمیع آہوجا' رشید امجد' خالد فتح محمد' مرتضیٰ برلاس' شہزاد نیر' بشریٰ رحمٰن اور جان کاشمیری نمایاں ہیں۔

آج کا مطلع

ہوائیں شور پر ہیں اور چمن جاگے ہوئے ہیں
گھروں میں جا بجا گل پیرہن جاگے ہوئے ہیں

یہ نہیں ہوسکتا!

اعمال نامہ
☆☆☆
ارشاد بھٹی
Irshadbhatti147@gmail.com



یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ زندگی فرعون کی ہو اور آخرت موسیٰؑ کی ملے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ محبتیں حسینؓ سے ہوں اور اطاعتیں یزید کی اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دماغ کربلا میں ہو اور دل میں بسی رہے دنیا۔

حضرت عمرؓ خلیفہ، یمن کے گورنر موسیٰ اشعریؓ توجہ دلائیں، نہ ڈاک کا نظام ایسا منظم کہ خطوط پر دن، وقت کی مہر، نہ آپؓ کے فرمانوں پر تاریخ، اکثر مشکل پیدا ہو جائے کہ پہلا حکم کون سا اور دوسرا کون سا، کیوں نہ اپنا کیلنڈر بنا لیا جائے، امیرالمومنینؓ کو تجویز پسند آئی، اکابر صحابہؓ کو اکٹھا کیا، معاملہ سب کے سامنے رکھا، مشاورت ہوئی، سب کا متفقہ فیصلہ اسلامی کیلنڈر بنانے کا، سب کا اس پر بھی اتفاق کہ اسلامی کیلنڈر کا آغاز رسولؐ خدا کی ہجرت (مکہ سے مدینہ) سے، چونکہ ہجرت ہوئی محرم میں، لہٰذا اسلامی کیلنڈر کا پہلا مہینہ قرار پایا محرم، یہاں یہ یاد رہے کہ جیسے کائنات کی تخلیق کے وقت ہی وقت کی تقسیم بھی ہو چکی تھی، ویسے ہی اسلامی کیلنڈر کا پہلا مہینہ قرار پانے سے پہلے ہی محرم حرمت والا مہینہ، سورہ توبہ میں ارشاد خداوندی ''اللہ کے نزدیک 12 مہینے، ان میں 4 ماہ ادب والے''، یہ چار مہینے رجب، ذوالقعدہ، ذوالحج اور محرم، اسلام سے قبل بھی ان مہینوں میں لڑائی جھگڑا، قتال حرام، زمانہ جاہلیت میں بھی ان مہینوں میں عرب اپنی تمام لڑائیاں، سب جھگڑے وقتی طور پر ختم کر دیتے، یوں یہ چار ماہ عرب میں زمانہ امن کہلاتا، یہاں سوال یہ کہ چاروں ماہ قابل احترام کیوں، یا ان مہینوں میں ہی امن کیوں، تاریخ بتائے کہ اہل عرب 3 ماہ میں تو حج کیا کرتے، یعنی ذوالقعدہ میں گھروں سے نکلتے، ذوالحج میں حج کرتے اور محرم کے آخر تک واپس گھر پہنچ جاتے جبکہ اسلام سے قبل رجب عمرے کا مہینہ ہوتا، اہل عرب اس ماہ میں عمرہ کیا کرتے بالکل ایسے ہی جیسے آج کل رمضان میں عمرہ کیا جائے، یہی وجہ کہ ان چاروں مہینوں کو حرمت والا سمجھا جاتا، لڑائی جھگڑوں سے پرہیز کیا جاتا۔

یہاں یہ بھی ذہنوں میں رہے کہ جیسے اسلامی کیلنڈر کا آغاز نبیؐ کی ہجرت سے، باقی مذاہب کے کیلنڈر بھی ان کے بڑوں سے منسوب مثلاً مسیحی سال حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے شروع ہو، یہودی اپنا سال حضرت سلیمانؑ کی تخت پوشی سے شروع کریں، رومنوں کا سال سکندر کی پیدائش سے شروع ہو اور ہندوؤں کا سال راجہ بکرماجی کی پیدائش سے شروع ہو، یہ بھی ذہنوں میں رہے کہ جیسے محرم شروع سے اہمیت کا حامل، حرمت والا مہینہ، ویسے ہی یہ تاریخی بھی، روایات کے مطابق محرم میں ہی اللہ تعالیٰ نے زمین، آسمان، پہاڑ، سمندر، لوح، قلم اور جبرائیل سمیت فرشتوں کو پیدا کیا، محرم میں ہی حضرت آدمؑ کی پیدائش، توبہ کی قبولیت بھی، محرم میں ہی حضرت نوحؑ کو طوفان سے نجات ملی، محرم میں ہی حضرت موسیٰؑ کو فرعون سے نجات ملی، محرم میں ہی حضرت یونسؑ کی توبہ قبول ہوئی، وہ مچھلی کے پیٹ سے باہر آئے، محرم میں ہی حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے، اسی ماہ میں ان کو آگ میں پھینکا گیا اور آگ گلزار بنی، محرم میں ہی حضرت داؤدؑ کی دعا قبول ہوئی، محرم میں ہی حضرت سلیمانؑ کو سلطنت ملی، محرم میں ہی حضورؐ کے وصال کے 50 سال بعد حق و باطل کا معرکہ کربلا برپا ہوا اور کہا جائے کہ محرم میں ہی قیامت بھی آئے گی۔

اسلام سے قبل اہل عرب میں دسویں محرم کا روزہ رکھا جاتا، بلکہ حضورؐ نے بھی مکہ میں یہ روزہ رکھا، ایک روایت یہ بھی کہ مدینہ میں حضورؐ نے یہودیوں سے پوچھا ''آپ 10 محرم کو روزہ کیوں رکھتے ہیں''، یہودیوں کا جواب تھا ''چونکہ فرعون سے نجات ملنے کے بعد حضرت موسیٰؑ نے 10 محرم کو شکرانے کے طور پر روزہ رکھا، اس لئے ہم بھی یہ روزہ رکھتے ہیں''، یہ سن کر آپؐ نے فرمایا ''موسیٰؑ ہمارے بھی ہیں'' پھر روایت یہ بھی کہ مسلمانوں کو یہودیوں سے الگ کرنے کیلئے آپؐ نے فرمایا ''آئندہ میں محرم میں نویں، دسویں کے دو روزے رکھوں گا'' لیکن اگلے محرم سے پہلے آپؐ کا وصال ہوگیا، البتہ صحابہ کرامؓ نے بعد میں حضورؐ کے فرمان کے مطابق نویں، دسویں کے دو روزے ہی رکھے، یہاں یہ بھی یاد رہے کہ رمضان المبارک کے بعد محرم کے روزے فرض تو نہیں رہے لیکن ان کا اجر و ثواب رمضان کے روزوں کے بعد سب سے زیادہ۔

اب بلاشبہ محرم پہلے ہی حرمت والا اور تاریخی، لیکن واقعہ کربلا نے محرم کو امر کر دیا، خانہ کعبہ میں پیدا ہونے والے، بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے، شہر علم کے دروازے، داماد رسولؐ، فاتح خیبر، شیر خدا اور چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ اور حضورؐ کی لاڈلی بیٹی، خواتین جنت کی سردار فاطمہؓ زہرا کے لخت جگر، نوجوانان جنت کے سردار امام حسینؓ کی محرم میں اہل و عیال سمیت قربانی ایسی کہ بلاشبہ ''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد''، وہ حسینؓ جن کا مرتبہ، مقام اور شان یہ کہ مسجد نبویؐ، حضورؐ کی امامت، سب سجدے میں، نواسے کا حضورؐ کی پشت مبارک پر بیٹھ جانا، آپؐ کا سجدہ لمبا کر دینا، تب تک سر نہ اٹھانا جب تک نواسے کا کمر مبارک سے اتر نہ جانا اور یوں نہ صرف حضورؐ پاک بلکہ پیچھے نماز پڑھتے صحابہ کرامؓ کا سجدہ بھی طویل ہو جانا، یہ حدیث نبویؐ بھی سنیے کہ ''جس نے حسنؓ اور حسینؓ سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی، جس نے ان سے بغض رکھا، اس نے مجھ سے بغض رکھا''، ایک دفعہ حضورؐ نے اپنے نواسوں کو گود میں بٹھا کر یہ دعا بھی فرمائی کہ ''الٰہی میں ان سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان سے محبت رکھ''، حضرت عمرؓ فرمائیں، ایک بار میں نے یہ دیکھ کر کہ حسنؓ، حسینؓ حضورؐ کے کندھوں پر سوار جب کہا ''کتنی اچھی سواری ہے'' تو حضورؐ بولے ''یہ بھی تو دیکھو سوار کتنے اچھے ہیں'' ایک مرتبہ آپ منبر پر بیٹھے جمعہ کا خطبہ دے رہے، لمبی لمبی قمیصیں پہنے امام حسنؓ اور حسینؓ لڑکھڑا کر چلتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے، یہ دیکھ کر حضور منبر سے نیچے تشریف لائے، دونوں کو گود میں اٹھا کر واپس منبر پر تشریف فرما ہو کر بولے ''میں نے انہیں جب لڑکھڑا کر چلتے دیکھا تو سوچا کہیں گر نہ جائیں، اسی لئے خطبہ چھوڑ کر انہیں اٹھا لیا، پھر فرمایا ''سچ کہا اللہ نے اولاد اور مال آزمائش ہے''۔

اب محرم اور کربلا، مطلب حرمت والا مہینہ اور عظیم قربانی، یہ ذہنوں میں رکھ کر بتائیے کہ وہ محرم جو زمانہ جاہلیت میں بھی حرمت والا، وہ محرم جس میں دنیا کے اجڈ ترین اور سب سے بڑے جھگڑالو پرامن ہو جاتے، تلواریں نیام میں ڈال لیتے، جرم، گناہ سے پرہیز کرنے لگ جاتے، اس حرمت والے محرم میں آج نبیؐ کی امت کا کیا حال، کیا حرمت والے مہینے میں بھی مومنوں کے ہاتھوں مومنوں کے گلے نہیں کاٹے جا رہے، عزتیں نہیں لوٹی جا رہیں، ڈاکے نہیں مارے جا رہے، ہر دو نمبری نہیں ہو رہی، ویسے تو مومنوں کی ہر دو نمبری کو رمضان میں پہیے لگ جائیں لیکن دکھ کی بات یہ کہ ہجرت سے شروع ہوئے محرم میں محمدؐ کی امت ایک مہینے کیلئے بھی دنیا سے دین، گناہوں سے نیکیوں، برائی سے اچھائی کی طرف ہجرت نہ کر پائے، اب آ جائیے کربلا پر، اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے کیا سیکھا ہم نے اس قربانی سے، کیا حاصل ہوا ہمیں اس عظیم قربانی سے، عملی طور پر کیا بدلاؤ آیا ہماری زندگیوں میں، کیا ایسا تو نہیں کہ اب باتیں، باتیں اور صرف باتیں ہی رہ گئیں، مان جائیے کہ اب ہم زمانہ جاہلیت کے گنواروں سے بھی بدتر، مان جائیے کہ ہم قرآن کا پیغام بھلا بیٹھے، نبیؐ کے اسوۂ حسنہ سے بھٹک گئے، مان جائیے کہ بدر سے کربلا تک اب ہمارے پاس خالی قصے، کہانیاں رہ گئیں، مان جائیے کہ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک اپنے بے آبرو، بے توقیر اور بے چین ہونے کی وجہ ہم خود ہی اور یہ سب تو ہونا ہی تھا کیونکہ یہ

کیسے ہوسکتا ہے کہ زندگی فرعون کی ہو اور آخرت موسیٰؑ کی ملے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ محبتوں کے دعوے حسینؓ سے اور اطاعتیں یزید کی اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دماغ میں کربلا اور دل میں بسی رہے دنیا، یہ نہیں ہوسکتا۔

(کالم نگار کے نام کیساتھ ایس ایم ایس اور واٹس ایپ رائے دیں 00923004647998)

روزنامہ جنگ لاہور 21 دسمبر 2017ء

جھوٹ کو صفائیاں دیتا سچ !

اعمال نامہ
☆☆☆
ارشاد بھٹی
Irshadbhatti47@gmail.com

شیخو جس کا کہنا کہ بیوی تو ایک بھی زیادہ' مگر کیا کریں ایک سے کم ہو نہیں سکتی' جسکا دُکھ کہ جب جوان تھا تو جوانوں کی عزت نہ تھی' بڑھاپے کی طرف بڑھا تو لوگ بوڑھوں سے تنگ' جسے ایک بار کہا گیا کہ ''خدا نے تمہیں اس لئے پیدا کیا کہ دوسروں کے کام آسکو'' بولا ''پھر دوسروں کو کس لئے پیدا کیا'' اور جسے بتایا گیا کہ ''حُسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے'' کہنے لگا ''حُسن نہ ہوا موتیا ہو گیا'' اسی شیخو کو چند روز پہلے موڈ میں دیکھ کر جب کہا ''حضور آج تو باتکے نوجوان لگ رہے'' تو احتیاط بھری خوشی سے وگ سنوارتے بولا ''کیا یاد دلا دیا' ایک وقت تھا کہ ہدایت کار نذر الاسلام مجھے اپنی فلم میں ہیرو کاسٹ کرنا چاہ رہے تھے'' اتنا کہہ کر خلاؤں میں گھورتے شیخو سے میں نے حیرت سے پوچھا ''پھر کیا ہوا'' کہنے لگا ''شبنم نہیں مانی'' میں نے پوچھ لیا ''وہ کیوں نہیں مانی'' جواب آیا ''بس جیلسی'' ''اب مجھ سے رہا نہ گیا' ''جیلسی ہی سہی' لیکن شبنم نے فیصلہ ٹھیک کیا'' جب کوئی جواب نہ آیا تو 2 ہیٹروں کے درمیان گرم چادر کی بکل مارے شیخو کو میں نے دوبارہ چھیڑا ''آج تو آپ ایسے ٹھٹھرے بیٹھے کہ کوئی پانی والی پستول دکھا کر بھی لوٹ لے لیکن یاد رہے کہ سردی اور بے عزتی جتنی زیادہ محسوس کی جائے' اتنی زیادہ لگے'' یہ سن کر شیخو طنزیہ انداز میں بولا ''اگر اسی طرح کی ایک آدھ ٹھنڈی جگت اور ماری تو واقعی مجھے ٹھنڈ لگ جائے گی'' میں نے کہا ''حضور عمر کے اس حصے میں جہاں بندہ 40 منٹ لگا کر کپڑے پہنے اور پھر 20 منٹ یہ سوچے کہ کپڑے پہنے کیوں' اسے سردی کے علاوہ بھلا اور لگ بھی کیا سکتا ہے'' سگار سلگاتا شیخو بولا ''پٹھان کا رات تین بجے فون بجا' فون اُٹھایا تو دوسری طرف سے بڑی رومینٹک آواز میں لڑکی بولی ''خان صاحب آپ جاگ رہے ہیں'' پٹھان نے غصے سے کہا ''بی بی یہ ضروری تو نہیں کہ ہر پٹھان چوکیدار ہی ہو'' میں نے کہا ''حضور ایک تو سوال گندم اور جواب چنا اور دوسرا یہ لطیفہ واقعی اتنا ٹھنڈا کہ اب ٹھنڈ کا احساس ہو رہا'' سگار کا ایک لمبا کش مار کر کہنے لگا ''چلو یہ سن لو' گاؤں سے نئے نئے شہر آئے سردار صاحب کو ایک شہری بلی نے اتنا تنگ کیا کہ ایک دن اسے پکڑا' تھیلے میں ڈالا' دوسرے محلے جا چھوڑا' لیکن واپس گھر آ کر دیکھا تو بلی پہلے سے موجود' سردار نے غصے میں دوبارہ بلی پکڑی' تھیلے میں ڈالی اور اس بار شہر کے دوسرے کونے جا چھوڑا' ایک گھنٹے کے بعد جب سردار جی کو گھر سے فون پر بتایا گیا کہ بلی پھر سے گھر پہنچ چکی تو انتہائی غصے سے بولے ''اس کمینی سے کہو مجھے بھی آکر لے جائے' میں راستہ بھول گیا ہوں'' شیخو نے بات مکمل کی تو میں نے کہا ''حضور اب واقعی ٹھنڈ لگنے لگی' اجازت دیں'' لیکن جاتے جاتے یہ بتا دوں کہ شبنم کا فیصلہ ٹھیک تھا''۔

صاحبو! اکیلا شیخو نہیں' اس وقت ہماری پوری سیاست اور سیاستدان ہی ایسے کہ سوال کچھ' جواب کچھ' بات کچھ' وضاحت کچھ اور صورتحال یہ ہو چکی کہ گھر کی دیوار بناتا وہ سردار جی یاد آجائے جسے ایک محلے دار نے جب کہا ''سردار جی آپ نے تو دیوار ٹیڑھی بنا ڈالی'' تو سردار جی نے جواب دیا ''تمہارا ابّا بھی تو جوا کھیلتا ہے'' سردار جی کو چھوڑیں' ہمارے ایک سیاسی دوست کی سن لیں' یہ وہی جو پیدا ہونے کے بعد 3 سال تک جب نہ بولا تو والدہ ایک پیر صاحب کے پاس لے گئیں اور پیر صاحب کی دعا سے زبان ایسی رواں ہوئی کہ اب گھر والے کیا ہم سب پھر سے پیر صاحب کو ڈھونڈ رہے' جو زبان سے سوچے' جسکا منہ دماغ سے زیادہ چلے اور جسے جب دیکھا' بولتے یا کھاتے ہی دیکھا' جسکا سر اوپر اور اندر سے خالی مگر فخریہ کہے' کیا ہوا جو سنوار نے کو بال نہیں' دھونے کو اتنا بڑا منہ تو ہے' جسکی صحت ایسی کہ دیکھ کر انشورنس ایجنٹ تک کا رنگ اُڑ جائے' جسکی یادداشت ایسی کہ خود کہے ''مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ بچپن میں جب اپنے دومنزلہ مکان کی چھت سے گرا تھا تو زندہ بھی بچا تھا یا نہیں' جسکے بارے میں سب کا اتفاق کہ ''یہ کوئی راز نہیں رکھ سکتا'' لیکن اسکا کہنا ''میں تو راز رکھ سکتا ہوں' وہ نہیں رکھتے' جنہیں میں بتاتا ہوں'' جو مصیبت کے وقت دوست کی مدد کو یوں پہنچے جیسے اسی موقع کی تلاش میں ہو' جس کا ہر بیان ایسا کہ لگے بلندی سے زمین پر آگرا' جس کی سیاست کے بارے میں ہماری وہی رائے جو لوگوں کی سیاست کے بارے میں' جو بتائے مجھے سیاست سے نفرت' مجبوراً سیاست میں آیا' سیاست میں اپنی کارکردگی سے وہ یہ ثابت بھی کر چکا' جس نے پچھلے الیکشن سے پہلے جب یہ کہا کہ ''اس بار ہماری پارٹی دیانتدار امیدوار کھڑا کرے گی'' تو ایک دوست بولا ''اس بار تو آپ کو کھڑا ہونا چاہیے تھا'' جس کا یہ کہنا کہ وہ عوام جن کا ناس مار دیا جائے' اسے عوام الناس کہیں' جس کا یہ ماننا کہ ہماری حکومتوں کے وعدے خاوندوں جیسے اور عوام سے پیار بیویوں جیسا اور جس کا یہ تجربہ کہ دنیا میں ساسوں کے بعد سب سے زیادہ سیاستدان بولیں' ہمارا یہی دوست کہے کہ ''عوام کو چاہیے کہ وہ سیاست کے دو اصول یاد رکھیں' پہلا یہ کہ سیاستدان حق پر اور دوسرا اصول یہ کہ پہلا اصول ٹھیک'' اسی کا تجربہ کہ ''اب تو یہ بھی ممکن کہ وقت آنے پر مسلم لیگ یہ ترمیم بھی پاس کروالے گی کہ انتقال کے بعد بھی کوئی شخص پارٹی صدر ہو سکتا ہے' اسی کا وجدان کہ ''پاکستان میں اب ہر اس سیاستدان کی سیاست خطرے میں جو دھرنے نہیں کروا سکتا اور اسی کی یہ منطق کہ ''جو سائیکل نہیں چلا سکتے' وہ ملک چلا رہے''۔

دوستو! جیسے سیاست دو قسم کی' ایک جسے کرنا آسان اور سمجھنا مشکل' دوسری جسے کرنا مشکل اور سمجھنا آسان' ویسے ہی سیاستدان بھی دو طرح کے' ایک جنہیں آج تک کوئی سمجھ نہ سکا اور دوسرے وہ جو آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آسکے' وقت ثابت کر چکا کہ غلطیوں کے علاوہ ہماری سیاست میں کوئی چیز اور پکنگ نہیں اور اتنی ہماری سیاست نے ترقی نہ کی جتنی سیاستدان کر چکے' ہمارے سیاستدان دنیا کے سیاستدانوں سے زیادہ سیاستدان' یہ ست رفتاری میں بہت تیز اور قیادت سے زیادہ عیادت کے اہل' کہا یہ بھی جائے کہ پاکستان سیاستدانوں' ڈاکٹروں اور مجرموں کی جنت' مگر اپنے سیاستدانوں کی حد تک یہ بات ماننے کو دل نہیں کرتا کیونکہ ہمارے سیاستدان تو اتنے نیک کہ جوتے لینے بھی مسجد جائیں اور پھر جب یہ اقتدار میں آئیں تو مدت اقتدار کی یوں پاسداری کریں کہ جیسے وہ سردار جی جسے ایک شادی میں مسلسل کھاتے دیکھ کر جب کسی نے پوچھ لیا کہ ''سردار جی آخر کب تک کھاؤ گے'' تو سردار بولا ''میں تو خود کھا کھا کر تھک چکا' لیکن کیا کروں شادی کارڈ پر لکھا تھا کہ ایک بجے سے تین بجے تک کھانا ہوگا'' دوستو! ویسے تو ہماری سیاست کبھی بھی قابلِ رشک نہیں رہی لیکن آج کل تو اخیر ہی ہو چکی' بہت پہلے لکھا تھا کہ جب تک سچ جوتے پہنے' جھوٹ آدھی دنیا کا چکر لگا آئے لیکن آج تو سیاسی گاڈ فادرز اور ان کے گینگ نے حالات ایسے کر دیئے کہ نہ صرف سچ ضعیف بابا ہو چکا بلکہ یہ بابا صفائیاں پیش کر رہا اور وہ بھی جھوٹ کو۔

وہ ہمیں بہت لاڈلا تھا



نقش خیال

☆☆☆

عرفان صدیقی

Irfan.siddiqui@janggroup.com.pk

وہ عمر میں مجھ سے کوئی سات برس چھوٹا تھا۔ گنتی شمار کی بات ہوتی تو اسے مجھ سے سات برس بعد اس دنیا سے رخصت ہونا چاہئے تھا لیکن اللہ کی حکمتیں اللہ ہی جانتا ہے۔ اس کی مرضی اٹل ہوتی ہے کہیں دور لوح تقدیر پر ہی لکھا تھا کہ وہ ہم پانچ بھائیوں میں سے پہلا ہوگا جو ہمیں چھوڑ کر چلا جائے گا اور ہم سو سو جتن کرنے کے باوجود اسے نہ روک پائیں گے۔ آج تک کون کسی کو روک پایا ہے۔ کب کوچ نقارہ بج اٹھتا ہے تو جانے والا پھیلے ہوئے ہاتھوں کی طرف دیکھتا ہے نہ اشک بار آنکھوں کی طرف۔ ایک نہ ایک دن ہم سب کو رخصت ہو جانا ہے۔ کسی کو ذرا پہلے، کسی کو ذرا بعد۔ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت کا نام موت ہے جو پیدائش کے لمحہ اول سے انسان کے ساتھ ساتھ چلتی اور کسی دن اچانک اس کی انگلی پکڑ کر دور کی وادیوں کو نکل جاتی ہے۔

انعام ہم سب سے منفرد تھا۔ مزاج اور افتاد طبع کے اعتبار سے کچھ کچھ سیلانی، اپنا راستہ خود چننے اور پھر سختی کے ساتھ اس پر استوار رہنے والا۔ تھوڑا تند خو لیکن انتہائی گداز دل رکھنے اور ٹوٹ کر محبت کرنے والا۔ بلا کا منظم، خوش خوراک اور خوش لباس، ڈاکخانے جیسے بے آب و رنگ محکمے میں اوسط درجے کی ملازمت کی لیکن طنطنے اور طمطراق کے ساتھ۔ جوانی کے لاابالی دور میں کسی موڑ پر فیصلہ کرلیا کہ شادی نہیں کرنی اور پھر عمر بھر اس موضع کے تذکرے کی اجازت بھی نہ دی۔ سیر و سیاحت کا شوق حد جنوں کو پہنچا ہوا۔ شمالی علاقہ جات سے اسے عشق تھا۔ جب بھی موقع ملتا، دو چار دوستوں کے ہمراہ کبھی گلگت، ہنزہ کو نکل جاتا کبھی اسکردو کو۔ ایک سے زیادہ بار شاید دنیا کے بلند ترین میدان دیوسائی کو نکل گیا جو فطرت کا ایک انتہائی نظر نواز عجوبہ ہے۔ بہت اچھا فوٹو گرافر تھا۔ ہمیشہ اچھے کیمروں کی ٹوہ میں رہتا۔ شعر و ادب کا پختہ ذوق، دیوسائی کی سیاحت پر ایک خوبصورت سفر نامہ لکھ دیا۔ انتہائی یار باش، اپنی گفتگو اور چٹکلوں سے محفلوں کو گرما دینے والا۔

میں نے مخصوص دوستوں کے ایک حلقے کو کم و بیش تیس پینتیس سال سے ایک کے ہمراہ دیکھا۔ اس کے اندر ایک غیر شعوری سی خواہش دبی رہتی تھی کہ سب اس کی مرضی و منشا کے مطابق چلیں۔ اس کی رائے ہی حرف آخر ٹھہرے۔ سو وہ دوستوں سے روٹھ جاتا تھا۔ کئی دن ناراض رہتا تھا اور پھر خود ہی سب کچھ بھول بھلا جاتا تھا۔ عمر بھر اس کے دوستوں کی کہکشاں کا کوئی ستارہ ٹوٹ کر اس سے الگ نہیں ہوا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ سب اسی کے مدار میں گردش کرنے پر مجبور تھے۔ وہ بے تکلف احباب کے حلقے میں بھی ''انعام صاحب'' ہی رہا۔

ہم سب اپنے اپنے گھروں کے ہو گئے۔ وہ والدہ کی خدمت کے لئے وقف ہو گیا۔ وہ بخت سعید لے کے آیا تھا سو اسے آخری آٹھ دس سالوں میں والدہ کی بے پناہ خدمت کا موقع ملا۔ ان کی بیماری میں وہ سائے کی طرح ان کے ساتھ رہا۔ ہمارے بہنوئی کے انتقال کے بعد ہماری اکلوتی بہن بھی والدہ کی خدمت کے لئے وہیں آ گئی۔ انعام، ماں اور بہن کے ساتھ بندھا رہا۔ اسے بہت شوق تھا کہ ہمارے بھائی کسی نہ کسی بہانے اس کے ہاں جمع ہوتے رہیں۔ سو وہ آئے روز کوئی نہ کوئی بہانہ وضع کر لیتا۔ سب کو اکٹھے کھانا کھلانا اور اپنے چہرے پر ایک مخصوص آسودگی کے ساتھ دیکھے چلے جاتا، اس کے دل میں محبت کا پتہ دیتا تھا۔ والدہ کے انتقال کے بعد، بہن کی رفاقت اس کا سہارا بنی، تسمیہ عمر میں اس سے بڑی تھی لیکن عملاً بڑائی کا منصب انعام نے سنبھالے رکھا۔ وہ ہم سب کی ماں تھی لیکن انعام کی وابستگی کی نوعیت ہی کچھ اور تھی۔ انتقال کے کئی دن بعد تک وہ چپکے سے اٹھتا، قبرستان پہنچتا اور پہروں ماں کی قبر کی سرہانے ہاتھ رکھے بیٹھا رہتا۔

خوش خوراکی اور زندگی کے من موجی انداز نے اسے شوگر کا مریض بنا دیا۔ جسم بھی خاصا فربہ تھا۔ وہ کبھی احتیاط کے تقاضوں کو بھی خاطر میں نہ لایا۔ دوا دارو کے باوجود مرض بڑھتا گیا۔ کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اسے زنجیر ڈال سکتا۔ میری روک ٹوک پر وہ ہاں ہوں کہہ دیتا لیکن کرتا وہی جو جی چاہتا۔ شوگر کا مرض اس کے حلقہ رفاقت کا واحد رفیق تھا جس نے اس کی ایک نہ سنی۔ اندر ہی اندر دیمک کی طرح اسے چاٹتا رہا۔ عجب بات یہ کہ اس کا وزن کم ہوا نہ اس کے عمومی انداز حیات پہ کوئی فرق پڑا۔ کوئی تین ماہ قبل بیٹھے بیٹھے اس کی شوگر بے حد کم ہو گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے بڑی مایوسی کا اظہار کیا لیکن کوئی دو گھنٹے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اگلے دن وہ گھر آ گیا لیکن جسم اس دھچکے کے بعد نہ سنبھل پایا۔ پھریوں ہوا کہ جسم سے پانی کا اخراج رک گیا۔ گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ ڈائیلسز کا تکلیف دہ عمل شروع ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے ہنستا کھیلتا، محفلوں کو گرماتا سدا بہار سا شخص وہیل چیئر پر آ گیا۔ ہفتہ بھر قبل کیفیت یہ ہو گئی کہ اس کے لئے اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونا اور اپنے بازوؤں کو حرکت میں لانا ممکن نہ رہا۔ 25 رمضان المبارک کو ہم نے اسے اسپتال داخل کرا دیا۔ اب عالم یہ تھا کہ شوگر بے قابو ہو گئی۔ طرح طرح کے جتن کر کے ڈاکٹر شوگر لیول بڑھاتے لیکن کچھ دیر بعد وہ پھر خوفناک حد تک کم ہو جاتا۔ 26 رمضان کو ہم سب دن بھر اس کے ساتھ رہے۔ وہ پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ ہم سے گفتگو کرتا رہا۔ ایک دوست سے کہنے لگا ''انشاء اللہ عید کے بعد ناران کاغان چلیں گے''۔ افطاری سے ذرا پہلے میں گھر آ گیا۔ اسی دوران اس کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ سانس لینے میں مشکل پیش آنے لگی۔ ڈاکٹرز اور عملہ موجود تھا۔ مصنوعی تنفس دیا جانے لگا۔ ستائیسویں رمضان کی شب نے دامن پھیلایا۔ مساجد میں عشاء کی نماز کی اذانیں بلند ہوئیں اور وہ ہمیں چھوڑ چھاڑ کر اس منزل کو روانہ ہو گیا جو ہم سب کی راہ دیکھ ہی ہے۔ وہ ہم سب سے منفرد، ہم سب سے جدا تھا۔ زندگی کو اپنے ڈھب سے گزارنے والا سیلانی شخص، انتہائی طرحدار آدمی، تیز دھار خودی اور تحکم رکھنے والا انسان، 26 رمضان کو جب میں اسپتال اسے ملنے گیا تو اس کے دائیں بازو پہ گلوکوز کی نلکی لگی تھی۔ بصد مشکل اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ پھر نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس کے ہونٹ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کپکپانے لگے جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ میں نے اسے تسلی دی۔ شاید اسے معلوم تھا کہ جدا ہونے کی گھڑی آ گئی ہے۔ حالت خراب ہو جانے کی خبر سنتے ہی میں خود گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا اسپتال پہنچا تو وہ گہری نیند سو چکا تھا۔ اب کے نہ اس کی آنکھیں بھر آئیں، نہ ہونٹ کپکپائے، نہ اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی کشادہ پیشانی پہ بوسہ دیا اور صرف اس قدر کہا ''ایسی بھی کیا جلدی تھی''۔

میت اس کمرے میں رکھی تھی جہاں وہ سویا کرتا تھا۔ اس کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک پر والدہ سوتی تھیں۔ دوسرے پہ انعام۔ اب وہ دونوں پلنگ سونے تھے اور ان کے بیچوں بیچ ایک تابوت رکھا تھا۔ میں ساتھ والے کمرے کی اس کرسی پہ بیٹھ گیا جہاں وہ گلی میں کھلنے والا دروازہ کھول کر اکثر بیٹھ جاتا اور کوئی کتاب پڑھتا رہتا تھا۔ میں نے دیکھا۔ الماری کے ساتھ شلوار قمیض کے ساتھ سوٹ خوبصورتی سے استری کئے لٹک رہے تھے۔ ان میں نیلی دھاریوں والے دو کرتے بھی تھے۔ میں نے طاہر سے پوچھا ''انعام تو ہمیشہ سادہ سلوار قمیض پہنتا تھا''۔ طاہر کہنے لگا ''اس بار اس نے خود پسند کر کے یہ دھاری دھار سوٹ لئے تھے کہ عید پر پہنوں گا''۔ ''میں نے کہا، یہ سارے سوٹ فوراً لپیٹ کر الماری میں رکھو۔ میرا دل ڈوبنے لگا ہے''۔

27 رمضان المبارک کو ہم نے اسے لٹھے کا ایک سفید سوٹ پہنایا اور اپنے مرحوم والدین کے نواح میں دفن کر آئے۔ میں عالم ارواح کے احوال و کوائف سے واقف نہیں۔ ممکن ہے والدین کی روحوں نے ماتھا چوم کر اس کا استقبال کیا ہو۔ ممکن ہے انعام سے مل کر ان کے ہاں کی رونقیں بڑھ گئی ہوں لیکن ہمیں تو وہ ویران کر گیا۔

وقت ہر زخم کا مرہم ہے۔ اس زخم پر بھی آہستہ آہستہ موم آ جائے گا لیکن زندگی سے جھلکتے اس شخص کو یوں موت کی آغوش میں جاتے دیکھ کر دل کھنڈر ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمتوں اور شفقتوں سے نوازے۔ وہ ہمیں بھی بہت لاڈلا تھا۔

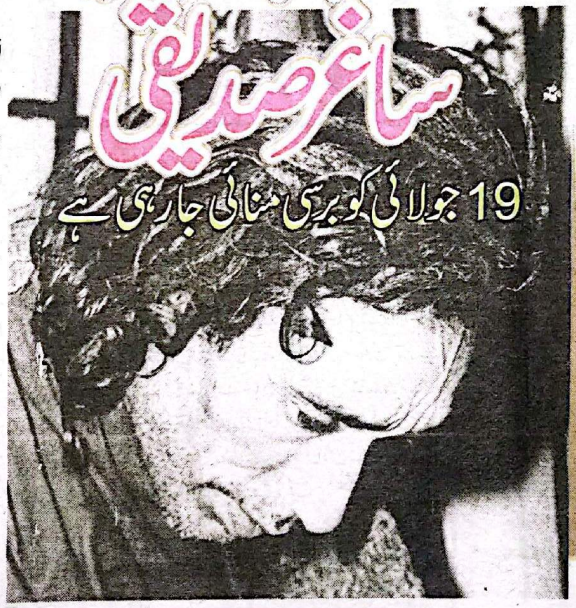


جہانِ ادب

جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

ساغر صدیقی

19 جولائی کو برسی منائی جارہی ہے



ساغر صدیقی، درویش شاعر کے نام سے موسوم ہیں، جنہوں نے پوری زندگی دنیا سے بے نیازی میں گزار دی۔ تاہم ان کے اشعار آج بھی زبان خاص و عام پر ہیں۔ وہ 1928ء میں انبالہ (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کا پیدائشی نام محمد اختر جبکہ قلمی نام ساغر صدیقی تھا۔ ان کا بچپن سہارن پور اور انبالہ میں گزرا۔ جو اردو اور پنجابی زبانوں کا سنگم کہلاتا ہے۔

1936ء میں جب ذرا شعور بیدار ہوا تو اردو اپنے گھر میں پڑھی۔ ان کے استاد کا نام حبیب حسن تھا یہیں سے انہیں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ وہ اپنے دوستوں کو بتاتے تھے کہ 1944ء میں امرتسر میں ماہانہ مشاعرے ہوتے تھے، جن میں وہ شرکت کرتے تھے۔ اس وقت ان کی صحت بہت اچھی تھی اور جوانی کا زمانہ تھا آواز میں گھن گرج تھی۔ شاعری میں بانکپن تھا وہ بہت جلد ادبی حلقوں کی پہچان بن گئے۔ اس زمانے کے دوستوں میں ظہیر کاشمیری احمد راہی بابو، یونس ادیب، لطیف انور، ساحر لدھیانوی، مرزا جانباز اور امین گیلانی شامل تھے۔ اب ان میں سے بھی کوئی حیات نہیں ہے اور یہ اپنے پیچھے کئی داستانیں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔

تاہم ساغر صدیقی کی زندگی کے ساتھ جو داستانیں وابستہ رہیں اور کسی کے ساتھ نہ تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ شاعر پراسراریت کے دھندلکوں میں کھو گیا اور ان کی زندگی پڑی سے ایسی اتری کہ اکثر لوگوں کے لئے سوالیہ نشان بن گئی۔ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ انہوں نے نوجوانی میں عشق کیا تھا جو ناکامی سے دوچار ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے دنیا سے قطع تعلق کر لیا اور شاعری ہی کو اپنے دکھ درد کا شعار بنا لیا۔ پھر لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ لاہور کے فٹ پاتھ ان کا گھر، کھلا آسمان ان کی چھت اور غموں کی چادر ان کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ یہی ان کی زندگی کا کل سرمایہ حیات تھی۔ باقی جہاں تک ان کے علمی و ادبی سرمایہ کا تعلق ہے وہ لوگ لوٹ کر لے گئے۔ ان کی زندگی کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے انتہائی معمولی قیمت پر ان کے ادبی شہ پاروں کو خریدا اور پھر خود شاعر بن گئے لیکن ساغر صدیقی کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ گمنام رہ کر بھی وہ ادبی دنیا کو اپنی صلاحیتوں سے مالا مال کرتے رہے۔ ساغر صدیقی کی تخلیقات میں لوح جنوں، شیشہ دل، غم بہار، سبز گنبد اور حضرت سلطان باہو کے دوھوں کا اردو ترجمہ شامل ہے وہ اگرچہ نام و نمود کے خواہش مند نہ تھے لیکن ادبی دنیا کے مبصرین نے ان کے فن اور شخصیت پر لکھا۔ چنانچہ ایک کتاب ان کے فن اور شخصیت پر لکھی گئی جبکہ دوسری کتاب ''داستان ساغر'' ان کی زندگی اور موت پر مشتمل ہے۔ ایک کتاب ''چادر صحرا'' ان کی غزلوں کے انتخاب پر مبنی ہے۔ ''شکست ساغر'' ان کی سوانح ہے۔ نامور اہل قلم نے ان کی زندگی پر جو مضامین لکھے ان کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ''کلیات ساغر'' میں ان کا پورا کلام شامل ہے ساغر نے بے شمار پنجابی فلمی گیت بھی لکھے۔ اصل میں ہوتا یہ تھا کہ ان کے گرد قدردانوں کا میلہ لگا رہتا تھا اس طرح فلمی دنیا کے لوگ بھی انتہائی کم معاوضے پر ان سے گیت لکھوا کر لے جاتے۔ ان کا انتقال 19 جولائی 1974ء کو ایک فٹ پاتھ پر ہوا۔ وہ خود تو کسمپرسی، مفلسی، بے بسی اور بے کسی میں چل بسے جبکہ ان کی موت کے بعد ان کی کتابوں سے اب بھی لوگ لاکھوں کما رہے ہیں۔ ان کی آخری آرام گاہ قبرستان میانی صاحب ہے، جہاں آج بھی ساغر میلہ کا انعقاد ہوتا ہے۔ ان کے دوست یونس ادیب نے اس میلے کو شروع کیا تھا، تاہم وہ خود بھی 2000ء میں انتقال کر کے ساغر صدیقی کے پہلو میں جا سوئے۔ ان کی قبر کے کتبے پر تحریر ہے۔

یاد رکھنا ہماری تربت کو
قرض ہے تم پہ چار پھولوں کا

منتخب کلام

چراغ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے
وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے
مجھے تمہاری نگاہوں پر اعتماد نہیں
میرے قریب نہ آؤ بڑا اندھیرا ہے
فراز عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ بڑا اندھیرا ہے
ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ بڑا اندھیرا ہے
بصیرتوں پہ اجالوں کا خوف طاری ہے
مجھے یقین دلاؤ بڑا اندھیرا ہے
جسے زبان خرد میں شراب کہتے ہیں
وہ روشنی سی پلاؤ بڑا اندھیرا ہے
بنام زہرہ جبینان خطۂ فردوس
کسی کرن کو جگاؤ بڑا اندھیرا ہے

منتخب اشعار

میرے دامن میں شراروں کے سوا کچھ بھی نہیں
آپ پھولوں کے خریدار نظر آتے ہیں

.....

ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں

.....

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

.....

بے وجہ تو نہیں ہیں چمن کی تباہیاں
کچھ باغباں ہیں برق و شرر سے ملے ہوئے

.....

فقیہ شہر نے تہمت لگائی ساغر پر
یہ شخص درد کی دولت کو عام کرتا ہے

.....

جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

.....

کہیں لخت جگر کھانے سے ساغر بھوک مٹتی ہے
لہو کے گھونٹ پی کر بھی کوئی محمود ہوتا ہے

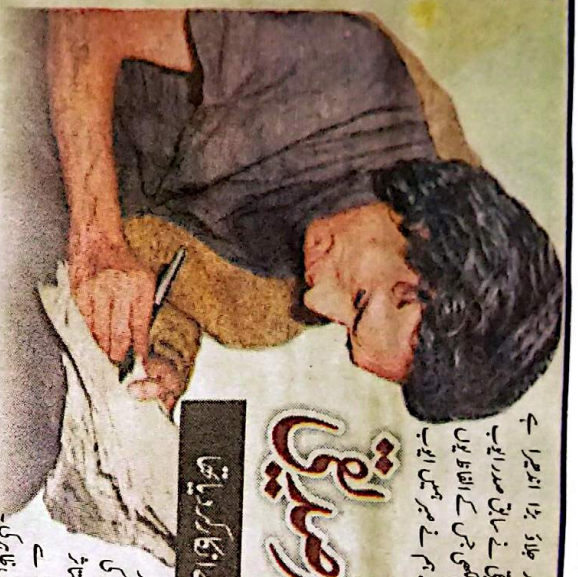
.....

میرے وطن کے غریبوں کو ڈھانپنے کیلئے
بتائے خواجہ اقلیم کی ضرورت ہے

(تحریر: رؤف ظفر)

روزنامہ جنگ لاہور (8) 19 جولائی 2014ء

عہد ساز شاعر ساغر صدیقی



انہوں نے صدر ایوب خان سے ملنے سے انکار کر دیا تھا

کاشان علی قریشی

ساغر صدیقی اردو ادب میں منفرد اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ساغر صدیقی 1928 کو ابنالہ (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محمد اختر شاہ اور قلمی نام ناصر حجازی تھا۔ ساغر صدیقی امرتسر سے پاکستان آئے اور دیوہیکل روڈ پر واقع ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ قیام پاکستان کے وقت ان کی عمر 19 برس تھی۔ ساغر صدیقی نے زندگی بھر سخت اور مشکل حالات کا سامنا کیا مگر اس کے باوجود انہوں نے یادگار غزلیں لکھیں۔ ان کی شاعری میں غم اور اداسی نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان پر کئی کتب لکھی گئیں۔ ساغر صدیقی کی زندگی پر دو کتب تحریر کیں۔ پہلی کتاب "دنیا ساغر صدیقی" اور دوسری کتاب "دنیا ساغر صدیقی شخصیت" انہوں نے ایک بزرگ حبیب حسن خان سے تعلیم حاصل کی۔ ان کے ادبی دوستوں میں تاج سیالوی، لطیف ظہیر، نعیم کشمیری، احمد راہی اور مرزا ادیب شامل ہیں۔ انکی داستان، باپ کا گناہ، درد تو سوہانی غلام اور مزدور فلموں اور انہی فلموں کے گانے ساغر صدیقی نے لکھے۔ یہ بات حیران کن ہوگی کہ ساغر صدیقی نے صرف پانچ جماعتیں پاس کی تھیں۔ یہ گانا انہوں نے کشمیری خوبصورت وادیوں میں لکھا اور اپنی آواز میں گایا۔ اس گانے کے الفاظ یوں تھے "سلام اے قائداعظم"۔ اس وقت کی حکومت نے ان کی اردو زبان پر عبور کو دیکھتے ہوئے ان کی ڈیوٹی حفاظتی ترانے کو منظور کیا۔ 1952 میں ان کی والدہ کا انتقال ہوا۔ ساغر صدیقی کی والدہ کا انتقال ان کے لئے بہت بڑا صدمہ تھا۔ یہ گانا انہوں نے اپنی والدہ کی یاد میں لکھا۔ ساغر صدیقی نے اپنی زندگی میں بہت سے مشاعرے پڑھے۔ ان کا پہلا مشاعرہ 1947 میں ریڈیو پاکستان لاہور سے ہوا۔ ساغر صدیقی کا پہلا مجموعہ کلام "زہر آرزو" 1947 میں شائع ہوا۔ ان کا دوسرا مجموعہ کلام "لمحوں کی صلیب" 1965 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا تیسرا مجموعہ کلام "شب آگہی" 1967 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چوتھا مجموعہ کلام "تیشہ دل" 1968 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا پانچواں مجموعہ کلام "غم بہار" 1971 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چھٹا مجموعہ کلام "کلیات ساغر" 1973 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ساتواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا آٹھواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا نواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا دسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا گیارہواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا بارہواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا تیرہواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چودہواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا پندرہواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا سولہواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا سترہواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اٹھارہواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا انیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا بیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اکیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا بائیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا تیئسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چوبیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا پچیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چھبیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ستائیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اٹھائیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا انتیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا تیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اکتیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا بتیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا تینتیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چونتیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا پینتیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چھتیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا سینتیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اڑتیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا انتالیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چالیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اکتالیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا بیالیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا تینتالیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چوالیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا پینتالیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چھیالیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا سینتالیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اڑتالیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا انچاسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا پچاسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اکاونواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا باونواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ترپنواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چونواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا پچپنواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چھپنواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ستاونواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اٹھاونواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا انسٹھواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ساٹھواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اکسٹھواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا باسٹھواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا تریسٹھواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چونسٹھواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا پینسٹھواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چھیاسٹھواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا سڑسٹھواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اڑسٹھواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا انہترواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ستترواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اٹھترواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اناسیواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اسیواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اکاسیواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا بیاسیواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا تراسیواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چوراسیواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا پچاسیواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چھیاسیواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ستاسیواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اٹھاسیواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا نواسیواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا نوے واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اکانوے واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا بانوے واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ترانوے واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چورانوے واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا پچانوے واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا چھیانوے واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ستانوے واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا اٹھانوے واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ننانوے واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا سو واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو ایک واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو دو واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو تین واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چار واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو پانچ واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چھ واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو سات واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو آٹھ واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو نو واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو دس واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو گیارہواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو بارہواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو تیرہواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چودہواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو پندرہواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو سولہواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو سترہواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اٹھارہواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو انیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو بیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اکیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو بائیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو تیئسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چوبیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو پچیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چھبیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو ستائیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اٹھائیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو انتیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو تیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اکتیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو بتیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو تینتیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چونتیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو پینتیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چھتیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو سینتیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اڑتیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو انتالیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چالیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اکتالیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو بیالیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو تینتالیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چوالیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو پینتالیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چھیالیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو سینتالیسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اڑتالیسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو انچاسواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو پچاسواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اکاونواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو باونواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو ترپنواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چونواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو پچپنواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چھپنواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو ستاونواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اٹھاونواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو انسٹھواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو ساٹھواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اکسٹھواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو باسٹھواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو تریسٹھواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چونسٹھواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو پینسٹھواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چھیاسٹھواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو سڑسٹھواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اڑسٹھواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو انہترواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو ستترواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اٹھترواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اناسیواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اسیواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اکاسیواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو بیاسیواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو تراسیواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چوراسیواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو پچاسیواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چھیاسیواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو ستاسیواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اٹھاسیواں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو نواسیواں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو نوے واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اکانوے واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو بانوے واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو ترانوے واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چورانوے واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو پچانوے واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو چھیانوے واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو ستانوے واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو اٹھانوے واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا ایک سو ننانوے واں مجموعہ کلام "شب راز" 1974 میں شائع ہوا۔ ساغر صدیقی کا سو واں مجموعہ کلام "شب آگہی" 1974 میں شائع ہوا۔

روزنامہ جنگ لاہور (13) 28 ستمبر 2012ء

قرض چار پھولوں کا!

ہماری نظریں صرف امیر شعرا پر ہی کیوں ٹھہرتی ہیں؟

کاشان علی قریشی

میں ایک بہت حساس اور تکلیف دہ موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہم اونچی قبروں کا تو خیال کرتے ہیں مگر کچی قبروں پر پھول نہیں ڈالتے۔ ہمیشہ چڑھتے سورج کو سلام کیا جاتا ہے۔ ہم اپنے شعراء کرام کو وہ عزت و احترام نہیں دیتے جس کا وہ حق رکھتے ہیں۔ آج کل چند خوشحال، طاقتور اور اثر و رسوخ رکھنے والے شعراء کرام کا کلام ہی سنایا جاتا ہے۔ ان ہی چند شعراء کرام کی تعریف کی جاتی ہے۔ افسوس، باقی شعراء کرام کا کیا قصور ہے، اس لئے کہ وہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا تعلق طاقتور، خوشحال طبقے سے نہیں۔ مختلف جگہوں پر ہم چند امیر طبقے کے شعراء کرام کی تعریف اور اشعار پڑھتے رہتے ہیں، مگر مجال ہے کہ ہم نے کبھی محروم طبقے سے تعلق رکھنے والے شعرا کا کلام پڑھا ہو یا ان کی کبھی تعریف کی ہو۔ ان شاعروں میں ساغر صدیقی، مجید امجد، احسان دانش اور استاد دامن وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی سادہ زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اپنی زندگیوں کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ یہ تمام شاعر حضرات معاشرے کی بے حسی اور معاشی تنگ دستی کا شکار ہوئے۔ ساغر صدیقی شاعری میں ایک بڑا مقام رکھتے ہیں، بدقسمتی سے معاشرے نے ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ یہ بڑا شاعر 1928ء میں پیدا ہوا اور 19 جولائی 1974ء کو ہم سے جدا ہو گیا۔ ساغر صدیقی نے اپنے دور میں مشہور اور یادگار غزلیں لکھیں۔ ان کا کلام پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ یقیناً عظیم شاعر تھے۔

اسی طرح مجید امجد کا نام بھی شاعری میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ شاعر 1914ء میں پیدا ہوا اور 1974ء میں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ وہ فارسی، عربی اور انگریزی پر عبور رکھتے تھے۔ اس وقت کے ادبی حلقوں نے ان کو نظر انداز کئے رکھا مگر وہ اس بات کو کبھی زباں پر نہیں لائے۔ مجید امجد کلام کے حجم اور معیار، دونوں لحاظ سے دور حاضر کے بعض اہم شاعروں سے بڑھ کر ہیں۔ مجید امجد اس لحاظ سے اس دور کے بڑے شاعر ہیں کہ انہوں نے اپنی شاعری میں خاص کر کے نظم معریٰ میں ہیئت کے اعتبار سے نت نئے تجربات کئے۔ مجید امجد کی وفات بڑے دل گداز حالات میں ہوئی، ان کی وفات کے ساتھ ہی کچھ افراد ان کی شاعری کو چوری کرنا چاہتے تھے مگر جاوید احمد قریشی ان دنوں ڈی سی ساہیوال تھے، ان کی زیر نگرانی مسودات ایک بینک کے لاکر میں رکھوا دیئے گئے۔



ساغر صدیقی



مجید امجد

احسان دانش معروف شاعر ہیں۔ انہوں نے نہایت غربت میں آنکھ کھولی جس کے باعث وہ پرائمری تک بھی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ پیٹ بھرنے کے لئے انہوں نے اینٹیں ڈھوئیں، پھاوڑا چلایا اور چپڑاسی جیسی نوکریاں کیں۔ وہ لاہور میں شملہ پہاڑی پر چوکیداری بھی کرتے رہے۔ انہوں نے کبھی اس محنت مزدوری کو اپنے لئے عار نہیں سمجھا۔ ان کی شاعری درد و غم اور سوز گداز کی کیفیت سے لبریز ہے۔ ایسے بڑے انسان جو انسانوں سے پیار محبت کرتے تھے اب دوبارہ کبھی نہیں آئیں گے۔ ہمیں اپنا رویہ تبدیل کرنا پڑے گا۔ ایسے تمام افراد کو عزت و احترام دینا پڑے گا۔ وہ ہمارے ہیرو ہیں ان کی قدر کرنا ہمارا فرض ہے۔

ہم ادبی محافل میں ساغر صدیقی، مجید امجد احسان دانش اور استاد دامن کو بھول جاتے ہیں

خالد یزدانی

پرانی یادوں کے اس سلسلے میں قارئین کو لاہور کی علمی ادبی فلمی صحافتی سماجی اور معاشرتی زندگی اپنے عروج پر دکھائی دے گی۔ یہ اس سنہری دور کی بھولی بسری داستان کے علاوہ مٹتی ہوئی اخلاقی اقدار کا نوحہ اور خوشگوار یادوں کا خزینہ بھی ہے۔ اس میں بھولے بسرے چہرے نابغہ روزگار شخصیات اور لاہور کے گمشدہ مناظر اپنی تمام رعنائیوں کیساتھ جلوہ گر نظر آئیں گے۔ اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں۔



سنہرے لوگ۔ سنہری یادیں

”لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں“

درویش شاعر ساغر صدیقی کی زندگی کے شب و روز کی کہانی!

لاہور سے بڑے بڑے نابغہ روزگار شخصیات کا عروج و زوال دیکھا ہے۔ اس کے دامن میں ایسی ایسی کہانیاں ہیں جو تاریخ کے صفحات پر آج بھی رقم ہیں۔ اسی شہر میں درویش شاعر ساغر صدیقی نے بھی اپنی شاعری سے نہ صرف اپنا آپ منوایا بلکہ اس کی شاعری سے کئی صاحب دیوان بھی بن گئے اس کا اپنا رنگ تغزل سب سے جدا اور منفرد تھا

امید کے موتی ارزاں ہیں، درویش کی جھولی خالی ہے
پھولوں سے مہکتے داماں ہیں درویش کی جھولی خالی ہے
کلیوں کی مہک ہوتا، تاروں کی ضیا ہوتا
میں بھی ترے گلشن میں پھولوں کا خدا ہوتا
جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

ساغر صدیقی آج اس جہان فانی میں نہیں لیکن اس کے اشعار کی بازگشت آج بھی گونج رہی ہے۔ یونس ادیب ساغر صدیقی کی وفات کے بعد ہر سال ساغر کا عرس مناتے تھے اور جب یونس ادیب بھی چل بسے تو یہ روایت بھی دم توڑ گئی۔ شاید اسی لئے عارف علی عارف نے لکھا تھا کہ ساغر کا وجود شاید دست یزداں نے خاک غمناک میں گوندھ کر تخلیق کیا تھا ساغر صدیقی شہر لاہور کی راہوں پر ننگے پاؤں پھرتا رہا۔ ساغر صرف ایک مست الست بنجارہ ہی نہیں تھا بلکہ اس بے رحم دنیا کے ماتھے پر سوالیہ نشان بھی تھا جو کبھی زندوں کی قدر دان نہ رہی یہ مردہ پرست دنیا ہے ساغر کی ذاتی زندگی کچھ بھی ہو اس کی کہانی کیسی ہی کیوں نہ ہو وہ بلاشبہ ایک عظیم شاعر شاہکار رجذبوں کا امین اور گدڑی میں چھپا لال ہے ساغر اپنی زندگی کے شب و روز کو اس طرح بیان کرتا ہے۔ میری زندگی زنداں کی ایک کڑی ہے۔ 1928ء کے کسی ماہ میں پیدا ہوا ہوں۔ ماں کی

کئی دفعہ دوستوں نے ان کا پھٹا پرانا لباس دیکھ کر نئے کپڑے بنوا دیئے
ساغر صدیقی یہ کپڑے لے لیتے لیکن داتا گنج بخشؒ کے
دربار پر جا کر کسی فقیر کو دے دیتے خود کالا کمبل اوڑھے رہتے

مامتا باپ کی شفقت اور کہاں پیدا ہوا ہوں۔ یہ سب میرے لئے علی بابا چالیس چور کے پراسرار غار کی کہانی ہے۔ میں نے دنیا میں خداوند رحیم و کریم سے بہن بھائی کا عطیہ بھی نہیں پایا۔ یہ معلوم نہیں کہ اس تنہائی سے یگانہ بنانا مقصود یا بیگانہ؟ دنیا کی چھ ستوں پر نظر رکھنے والے صاحب فراست لاہور کی سڑکوں پر مجھے جب چاہیں ٹوٹا ہوا بازو کالی چادر میں چھپائے، احساس کے الٹے پاؤں سے چلتا پھرتا دیکھ سکتے ہیں۔ اگر کوئی بھائی بہن ہوتا تو شاید یہ حال نہ ہوتا میں نے لوگوں سے اپنا نام محمد اختر سنا۔ البتہ ایک پرشکوہ ماضی کی سرسراہٹ میں نے اپنے پاؤں کے نیچے سنی ہے۔

میں نے بچپن کا دور بھی غربت میں صبر و شکر کے ساتھ گزارا ہے جو کچھ ملتا اسی پر بخوشی قناعت کرتا۔ میں نے شروع میں ناصر حجازی تخلص رکھا۔ تقریباً دو ماہ بعد پھر مجھے یہ تخلص واضح دکھائی نہ دیا تب میں نے اپنا تخلص ساغر صدیقی پسند کیا۔ جو آج تک موجود ہے۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے وقت میری عمر 19 برس کی تھی۔ جیسے جیسے حالات کا ارتقاء جاری رہا میرا شعور اسرار بائے کائنات کا حامل ہوتا گیا۔ تقسیم کے بعد سے صرف شعر لکھتا ہوں شعر پڑھتا ہوں، شعر کھاتا ہوں، شعر پیتا ہوں“

امید کے موتی ارزاں ہیں، درویش کی جھولی خالی ہے
پھولوں سے مہکتے داماں ہیں درویش کی جھولی خالی ہے

ساغر صدیقی اکثر ہسپتال روڈ میں اخبار مارکیٹ لوہاری چوک میں کتابوں کی دکان پر یا انارکلی میں گھومتے دکھائی دیتے اسی طرح خانم مارکیٹ انارکلی میں شاعر عطا نظامی سونے کے زیورات بنانے کا کام کرتے تھے ان کی دکان میں دوپہر کے بعد کوئی نہ کوئی شاعر ادیب موجود ہوتا تھا عطا نظامی کام کے ساتھ ساتھ آنیوالے مہمان کی خاطر تواضع بھی کرتے رہتے ساغر صدیقی اکثر ان کی دکان پر بھی آ



کر لائے جو روزنامہ ندائے ملت میں نمایاں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں شائع شدہ اس نظم کو کاٹ کر ندائے ملت کے مرکزی دروازے پر چسپاں کر دیا گیا تھا اخبار کے دفتر آنے والے یا وہاں سے گزرنے والے رک کر اس نظم کو پڑھتے تھے۔

ساغر صدیقی کے حوالے سے کئی واقعات مشہور ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جن دنوں وہ اردو کر کچھ دیر کے لئے ستا لیا کرتے تھے اور جب بھی سرراہے کوئی شناسا چہرہ دکھائی دیتا ان سے ایک روپیہ مانگ لیا کرتے تھے۔

علم الاعداد کے ماہر (جنہیں سب تایا کہتے تھے) بتاتے ہیں کہ میری ان دنوں انارکلی کے قریب دھنی رام روڈ پر جوتے بنانے کا کارخانہ تھا۔ علم و ادب کا شوق بچپن ہی سے تھا لہٰذا کئی اہل قلم بھی وہاں تشریف لائے تھے جبکہ ساغر صدیقی تو بلاناغہ آتے ایک دن میں جوتے بنا رہا تھا اور ساغر صدیقی سوچوں میں گم تھے ان کے کہنی سے چند جوئیں گر گئیں میں نے ان کو مار دیا جس پر ساغر صدیقی گویا ہوئے۔

تم نے ان کو مار کر اچھا نہیں کیا ان کو مت مارو انہوں نے غریب ساغر کا خون پیا ہے۔ ساغر صدیقی اکثر روزنامہ ندائے ملت لاہور کے دفتر جو چوک پرانی انارکلی لیک روڈ کے قریب ایک بلڈنگ کے نیچے میں تھا تشریف لاتے جناب مجید نظامی ان سے خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جن دنوں چند جنونی اسرائیلیوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسجد اقصیٰ کو آگ لگائی تو عالم اسلام میں نہ صرف اس پر شدید احتجاج ہوا تھا بلکہ پاکستان کے طول و عرض میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اسرائیلی حکومت کے اس اقدام کی پرزور مذمت کی گئی تھی۔ اسی حوالے سے مختلف اہل قلم نے اس پر تحریریں بھی لکھیں جبکہ ساغر صدیقی ایک نظم لکھ

بازار کے کسی فٹ پاتھ پر ساری رات اونگھتے تھے انہی دنوں کوئی عقیدت مند ان کو ایک کمبل دے گیا۔ ساغر صدیقی نے رات کو اسے اپنے قریب ہی باندھ لیا اور سگریٹ کے کش لگاتے سوچوں میں گم تھے کہ کمبل کی مسلسل آواز انہیں تنگ کرنے لگی جس پر انہوں نے سگریٹ کا دھواں کمبل کے منہ پر پھینکا اور چند منٹوں بعد ہی کمبل پرسکون ہو کر اونگھنے لگا۔

محمد خالد چودھری ساغر صدیقی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ساغر صدیقی سے میری پہلی ملاقات جناب حفیظ قدھاری پریس فوٹو گرافر نے کرائی تھی۔ قدھاری صاحب میرے بزرگ بھی تھے لیکن وہ مجھے اپنا دوست کہتے تھے۔

ایک دن حفیظ قدھاری تشریف لائے تو ان کے ساتھ ایک سادہ سا بندہ بھی تھا جس نے کالا کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ قدھاری صاحب بولے۔ ”یہ میرا روحانی دوست ساغر صدیقی ہے غزل کا بہت اچھا شاعر ہے“ میں نے ساغر صدیقی کی طرف دیکھا تو اس میں جمال ہی جمال نظر آیا۔ اس کی شکل میں فقیری تھی لیکن آنکھیں اداس تھیں۔ اس کی خاموشی زمانے کو ٹھوکر مار رہی تھی۔ پہلی ہی نظر میں ساغر میرا دوست بن گیا اور ہر روز چودھری اکیڈمی پر آنے لگا جوان دنوں چوک لوہاری گیٹ میں مسلم مسجد کے زیر سایہ قائم تھی۔ وہ صبح سویرے آتا اور دکان کے سامنے کمبل اوڑھ کر بیٹھ جاتا۔ میں دکان کھول کر ساغر صدیقی کو اندر لے آتا اور اپنے سامنے کرسی پر بٹھا کر اس کے چہرے سے روحانیت کشید کرنے لگتا۔ اس دوران میں ساغر سے پوچھتا ”چائے منگواؤں؟“ ساغر نے سادگی سے کہتا ”چودھری ناشتہ کرنا ہے“ ناشتے والا میری دکان کے سامنے ہی بیٹھتا تھا۔ میں اسے آواز دیتا۔ ”پہلوان تاج! میرے دوست کے لئے اچھا سا ناشتہ لے کر آؤ“۔ ساغر صدیقی ناشتہ کرتا اور پھر اچانک اٹھ کر کہیں چلا جاتا۔ میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جاتا ہے اور اتنی جلدی کیوں اٹھ جاتا ہے۔ یہ ہمارا روز کا معمول بن گیا تھا۔ جس صبح ساغر صدیقی نہ آتا میں اداس ہو جاتا۔ اس وقت کے بڑے بڑے اہل قلم ساغر صدیقی کے فن کی تعریف کرتے اور بتاتے تھے ”بہت سے لوگ ان کی غزلیں چرا کر اپنے نام سے چھپوا لیتے ہیں“۔ لیکن ساغر صدیقی تو اپنی دنیا میں گم رہنے والے بندے تھے۔

ان کی عجیب عادات تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ حفیظ قدھاری نے کئی دفعہ ساغر صدیقی کو کہا کہ ان کے پاس آ جائیں لیکن وہ اپنے حال میں ہی مست رہتے۔ کئی دفعہ دوستوں نے ان کا پھٹا پرانا لباس دیکھ کر نئے کپڑے بنوا دیئے۔ ساغر صدیقی یہ کپڑے لے لیتے لیکن داتا گنج بخشؒ کے دربار پر جا کر کسی فقیر کو دے دیتے۔ خود کالا کمبل اوڑھے رہتے۔ آخر ایک دن اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

بھولی ہوئی ہوا ہوں مجھے یاد کیجئے
تم سے کہیں ملا ہوں مجھے یاد کیجئے
نغموں کی ابتدا تھی کبھی میرے نام سے
اشکوں کی انتہا ہوں مجھے یاد کیجئے
منزل نہیں ہوں خضر نہیں راہزن نہیں
منزل کا راستہ ہوں مجھے یاد کیجئے

آیئے آج اس درویش شاعر جسے دنیا ساغر صدیقی کے نام سے جانتی ہے کے لئے دعائے مغفرت کریں جو جاتے جاتے یہ کہہ گیا ہے

اور کتنی دور ہیں ساغر عدم کی منزلیں
زندگی سے پوچھ لوں گا راستے میں گر ملی

ماں، وہ میری ماں، تمہاری ماں، وہ کُل دنیا کی ماں.....

معروف شعراء کا منظوم خراجِ عقیدت

مرتب : محمد ہمایوں ظفر

ماں، اللہ کی طرف سے انسان کو دیا جانے والا سب سے قیمتی اور نایاب تحفہ ہے۔ ایسا قیمتی و نایاب کہ جس کے تصور ہی سے دل عقیدت و محبت کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔ دیگر مذاہب کی تعلیمات کے مقابلے میں، اسلام میں ماں کے درجات کو بے حد بلند کیا گیا ہے۔ محسنِ انسانیت، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ پاک ہے کہ "یا شہ ماں، جنت کے دروازوں میں سے بہترین دروازہ ہے، اگر تو چاہے، تو اسے پار کر رکھ (اور جنت کا حق دار بن جا) اور چاہے، تو اسے چھوڑ دے۔" (مفہوم) حضرت علی کا قول ہے "میری محفوظ ترین پناہ گاہ میری ماں کی آغوش ہے۔" اسی طرح دنیا بھر کے مفکروں، دانش وروں نے بھی ماں کی بے لوث شفقت و محبت کو بڑے دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ شیخ سعدی کہتے ہیں کہ "محبت کی ترجمانی کرنے والی اگر کوئی چیز ہے، تو وہ صرف ماں ہے۔" یونانی سینا نے کہا کہ "اس بات سے ڈرو کہ ماں کی نظرت فریاد سے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے۔" اکبر اعظم نے کہا کہ "مجسم انسانیت کی حقیقی تصویر اپنی ماں کے چہرے پر دیکھ سکتا ہے۔" محمد علی جوہر فرماتے ہیں کہ "دنیا کی سب سے حسین شے ماں اور صرف ماں ہے۔" شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال نے کہا "سخت سے سخت دل کو ماں کی پُرنم آنکھوں سے موم کیا جاسکتا ہے۔" افلاطون کا کہنا ہے "جس کے دل میں ماں کے لیے محبت ہے، وہ زندگی کے کسی موڑ پر شکست نہیں کھا سکتا ہے۔" جب کہ مشہور مفکر ارسطو نے کہا تھا کہ "ماں سے ہم دردی رکھنے کے بجائے، ماں کا ہم درد ہونا چاہیے۔ اور مائیں، بابوں کی نسبت بچوں سے ہمیشہ زیادہ پیار کرتی ہے۔" غرض یہ کہ جہاں لاتعداد مفکروں، دانش وروں نے ماں کی شان میں عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کیے، ماں کے موضوع پر لاتعداد ادیبوں نے بے شمار تخلیقات پیش کیے، مصوروں نے اپنے فن پاروں کے ذریعے خراجِ تحسین پیش کیا، وہیں ماں کی عظمت پر مختلف شعراء بھی منظوم خراجِ تحسین و عقیدت پیش کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ذیل میں چند معروف شعراء کا ماؤں کی چاہت و الفت، ممتا و خلوص سے لبریز منتخب کلام پیش خدمت ہے۔

علامہ اقبال



حکیم الامت، شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنی ماں "بے جی" کی وفات پر اپنے افکار و خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ تاریخ ساز نظم کہی، جو آج بھی مسلم معاشرے میں ماں کی عظمت کے اظہار اور ساتھ ارتحال کے حوالے سے ایک شان دار خراجِ عقیدت ہے۔

جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں
اور اب چہرے ہیں جس کی شوخیٔ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے
علم کی سنجیدہ گفتاری بڑھاپے کا شعور
دینی احزاز کی شوکت جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں فکر سے آزاد ہیں
پھر اسے کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں
کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

تابش دہلوی



بارِ غم سے
قدم قدم
پر جھکل

خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

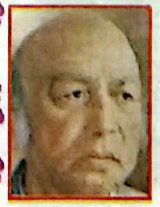
حفیظ جالندھری



جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی زوجِ محترمہ اور ان کے عظیم فرزند حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی مادرِ گرامی حضرت ہاجرہ کی اپنے بیٹے سے محبت و شفقت کو "ماں کی بے قراری" کے عنوان سے نام ور شاعر حفیظ جالندھری نے اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ خوب نظم کیا ہے:

پیمبر نے دعا کے بعد اس وادیٔ بے رحم موڑا
جنابِ ہاجرہ کو اور بچے کو یہیں چھوڑا
جنابِ ہاجرہ سمجھی تھیں اس وادیٔ وحشت میں
سنبھالے طفلِ عالی شان کو آغوشِ الفت میں
وہاں صحرا ہی صحرا تھا، چٹانیں ہی چٹانیں تھیں
جنابِ ہاجرہ یا ایک بچہ دو ہی جانیں تھیں
نہ داتا تھا، نہ پانی تھا، بھروسا تھا فقط رب پر
بڑھی جب دھوپ کی گرمی تو جاں آنے لگی لب پر
زمیں کا ذرّہ ذرّہ مہر کی صورت چمکتا تھا
بہت بے تاب تھی ماں گود میں بچہ بلکتا تھا
عطش کے کرب و بے چینی جو دیکھی اپنے جائے میں
لٹایا خاک پر بچے کو اک پتھر کے سائے میں
صفا مروہ پہ ہر سو وہ تلاشِ آب میں دوڑیں
کبھی اس سمت جاتی تھیں، کبھی اس سمت جاتی تھیں
خیال آتا تھا بچے کا تو فوراً لوٹ آتی تھیں
تڑپتے دیکھ کر بچے کو بڑھ جاتی تھی بے تابی
جدھر اٹھی نظر جھلملے ہوئے نیلے نظر آئے
یوں ہی بس سات بار آئی گئیں پانی نہیں پایا
چٹانیں سرخ پائیں دشت شعلہ آفریں پایا
قیامت کی گھڑی تھی پڑ گئے تھے پاؤں میں چھالے
چلی جاتی تھیں آنکھیں آب میں بچے میں دل ڈالے
سنی آواز ننھے کی بلکنے اور رونے کی
تڑپ اٹھیں کہ ساعت آگئی ہے جاں کھونے کی

حبیب جالب



یہ دل کے
مرے ٹکڑے

بچوں پہ چلی گولی
ماں دیکھ کے یہ بولی
یہ دل کے مرے ٹکڑے
یوں روئیں مرے ہوتے
میں دور کھڑی دیکھوں
یہ مجھ سے نہیں ہوگا
میں دور کھڑی دیکھوں
اور اہلِ ستم دیکھیں
خوں سے مرے بچوں کے
دن رات یہاں ہولی

ادا جعفری



مرے
دل کی
گلی ہے

یہ دھواں ہے کہ مرے دل کی گلی ہے، کیا ہے
میری آنکھیں ہیں کہ ساون کی جھڑی ہے، کیا ہے
وہ اندھیرا ہے کہ دم میرا گھٹا جاتا ہے
آگے کچھ دیکھنا چاہوں بھی تو دم آتا ہے
میں کہ نقدِ وفا، عفت و ناموسِ حیات
میرے انفاس سے روشن ہوا فانوسِ حیات
حرفِ آغاز بھی میں، نقطۂ انجام بھی میں
کل کی امید بھی میں، آج کا پیغام بھی میں
میں کسی خوابِ دل آویز کی تشکیل نہ تھی
جذبۂ لذتِ تخلیق کی تکمیل نہ تھی
میں تو خود خالق و کوزہ گر و صناع بنی
شہر بانو بھی مرا نام رہا مریم بھی

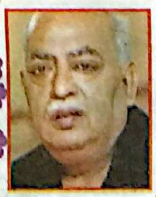
پروین شاکر



دوست
چڑیوں
کے لیے
کچھ حرف

بسے بسائے گھر کی تنہا چڑیا
چنی تازہ ہی آنکھوں کی ویرانی میں
چھم چھم جانے والے شہزادوں کی ماں کا دکھ ہے
تجھ کو دیکھ کر اپنی ماں کو دیکھ رہی ہوں
سوچ رہی ہوں
ساری مائیں ایک مقدر کیوں لاتی ہیں
گودیں پھولوں والی
آنگن پھر بھی خالی

منور رانا



بھارت کے شہر کولکاتا سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر، منور رانا نے ماں کے حوالے سے متعدد اشعار رقم کیے، جو آج زباں زدِ عام ہیں۔ ان کے چند منتخب اشعار نذرِ قارئین ہیں۔

کسی کو گھر ملا حصّے میں یا کوئی دکاں آئی
میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا مرے حصّے میں ماں آئی
☆.....☆.....☆
مجھے بس اس لیے اچھی بہار لگتی ہے
کہ یہ بھی ماں کی طرح خوش گوار لگتی ہے
☆.....☆.....☆
میں نے روتے ہوئے پونچھے تھے کسی دن آنسو
مدتوں ماں نے نہیں دھویا دوپٹا اپنا
☆.....☆.....☆
اب بھی چلتی ہے جب آندھی کبھی غم کی رانا
ماں کی ممتا مجھے باہوں میں چھپا لیتی ہے
☆.....☆.....☆
اے اندھیرے دیکھ لے منہ تیرا کالا ہوگیا
ماں نے آنکھیں کھول دیں، گھر میں اجالا ہوگیا
☆.....☆.....☆
میری خواہش ہے کہ میں پھر سے فرشتہ ہو جاؤں
ماں سے اس طرح لپٹ جاؤں کہ بچہ ہو جاؤں
☆.....☆.....☆
روشنی دیتی ہوئی سب لالٹینیں بجھ گئیں
خط نہیں آیا جو بیٹوں کا تو مائیں بجھ گئیں
☆.....☆.....☆
حادثوں کی گرد سے خود کو بچانے کے لیے
ماں ہم اپنے ساتھ بس تیری دعا لے جائیں گے
☆.....☆.....☆

نوشی گیلانی



ورثہ

بیٹیاں بھی تو ماؤں جیسی ہوتی ہیں
ضبط کے درد آنچل میں
سارے درد چھپا لیتی ہیں
روتے روتے ہنس پڑتی ہیں
ہنستے ہنستے دل ہی دل میں رو لیتی ہیں
خوشی کی خواہش کرتے کرتے
خواب اور خاک میں اٹ جاتی ہیں
سوختوں میں بٹ جاتی ہیں
گھر کے دروازے پر بیٹھی
امیدوں کے ریشم بنتے..... ساری عمر گنوا دیتی ہیں
میں جو گئے دنوں میں
ماں کی خوش نہیں پرنس دیتی تھی
اب خود یہی تو
عمر کی گرتی دیواروں سے ٹیک لگائے
فصلِ خوشی کی بوتی ہوں
اور خوشی نہیں کاٹ رہی ہوں
جانے کیسی رسم ہے یہ بھی
ماں کیوں بیٹی ہوتے ہوتے سب اپنا مقدر سے لیتی ہے

جاذب آفاقی

باچشمِ نم تیرا منانا یاد ہے

باتوں باتوں میں وہ اپنا روٹھ جانا یاد ہے
اور وہ باچشمِ نم تیرا منانا یاد ہے
بے سبب ہو کر خفا، کھانا نہ کھانا یاد ہے
اور وہ تیرا منتیں کرنے کھلانا یاد ہے
ہائے وہ کہنا ترا دل مت دکھا بیٹا مرا
بعد میرے کوئی اتنا بھی نہیں ہوگا ترا

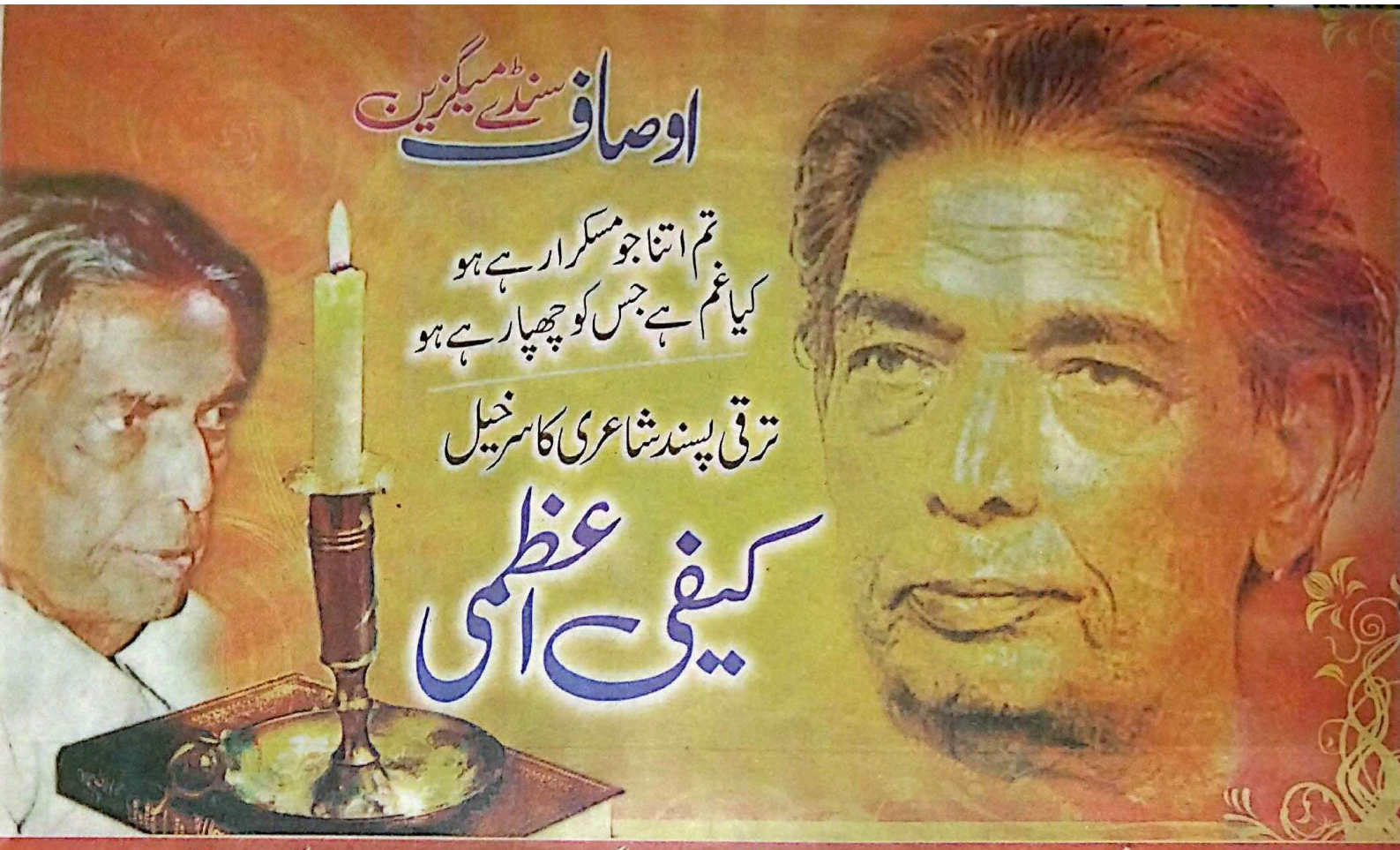
وصی شاہ

یہ کام یا بیاں، عزت، یہ نام تم سے ہے

یہ کام یا بیاں عزت یہ نام تم سے ہے
خدا نے جو بھی دیا ہے مقام تم سے ہے
تمہارے دم سے ہیں میرے لہو میں کھلتے گلاب
میرے وجود کا سارا نظام تم سے ہے
کہاں بساط جہاں اور میں کم سن و ناداں
یہ میری جیت کا سب اہتمام تم سے ہے
جہاں جہاں ہے مری دشمنی سب میں ہوں
جہاں جہاں ہے مرا احترام تم سے ہے

یاروں کو مشورت مری دولت پہ ہے لیکن
اک ماں ہے، جو بِن میری خوشی، دیکھ کے خوش ہے
☆.....☆.....☆
تیرے دامن میں ستارے ہیں تو ہوں تیرے سلک
مجھ کو اپنی ماں کی مٹھی اور امی اچھی لگی
☆.....☆.....☆
ابھی زندہ ہے ماں میری مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا
میں گھر سے جب نکلتا ہوں دعا بھی ساتھ چلتی ہے
☆.....☆.....☆
میں نے نکل شب چاہتوں کی سب کتابیں پھاڑ دیں
صرف اک کاغذ پہ لکھا لفظ ماں رہنے دیا
☆.....☆.....☆
مرے چہرے پہ ممتا کی فراوانی چمکتی ہے
میں پڑھا ہو رہا ہوں پھر بھی پیشانی چمکتی ہے

اوصاف سنڈے میگزین



ترقی پسند شاعری کا سرخیل

کیفی اعظمی

بحرِ سخن کا تیراک، نظم و غزل کا بے تاج بادشاہ — لفظوں میں رنگے، شعروں میں گندھے شاعر کی برسی پر قلم طرازی

احمد علی کیف

شعر کی ویران گاہوں میں چلتے ہوئے، شاعر حسرت و واماندگی کے صدا رہوں میں کھو کے رہ جاتا ہے۔ شاعر دل بکف امید کی کرنیں تلاش کرتا، آسمانوں کی مسافت میں گم کردہ راہ۔ شاعر وہ جو ایک لفظ کو لے کر عنوان کے شامیانوں تلے سجا دیتا ہے۔ شاعر وہ جو ایک کہانی کو حسن و تجسیم میں ڈھال کے رکھ دے۔ شاعر وہ جو حرف کی قدر جانتا ہی نہیں کرتا بھی ہے۔ شاعر، آغاز کا مسئلہ اٹھا کر، انتہا کی گلیوں میں ٹھکانا کرلے۔ شاعر، ازل کی کٹھنائیوں سے نبرد آزما۔ شاعر، ابد سے دست و گریباں۔ شاعر، خدا سے ہم کلام۔ شاعر، پیمبری کے منصب پہ فائز۔ شاعر، برسات کا گہنا۔ شاعر، سردیوں کی ملائمت۔ شاعر، گلابوں کے دوشالے بُننے والا۔ شاعر، گرمیوں میں دوپہر اوڑھ کر کلیوں کی پرورش کرنے والا۔ شاعر، لفظوں سے محل تعمیر کرنے والا۔ شاعر، سورج کو تختی پہ اُتار لے۔ شاعر، اگر گلدان کو چھولے تو پھول مہکنے لگیں۔ شاعر، مغرب کو مشرق میں تحلیل کر دے۔ شاعر، دوپہر کو صبح کی تمثیل بنا دے۔ شاعر..... شاعر، اگر لکھنے پر آئے تو کائنات کو حرف کی ایک تھیلی میں بند کر دینے میں دستِ راست رکھنے والا۔

فطرت جب تنوع کے پودے میں اپنا لمس اُتارے تو فکر کے لمحے ظہور جائیں۔ عقیدت کی تمنا اگر دلوں میں گھر کرنا چاہے تو جگہ کم پڑ جائے۔ سماعت کی روانی میں پھول ڈالنے ہوں تو آواز کی حدت متضاد ہو جائے۔ دریاؤں کا پانی پشت در پشت کشتیوں کو تیرا کی میسر کرنے میں عمریں زیاں کر رہا ہے لیکن ناخدائی کے شکوے ختم نہیں ہوئے۔ آب رواں پر تخت ڈال دیں لہریں سانسوں کو سنبھالنے میں ناکام ظہریں۔ سمندروں کی جاذبیت میں ازلوں کی وسعت اگر خاموش ہو جائے تو حضرت نوح کا وقت لوٹ آئے۔ خوابوں کی گیرائی میں خشکی آجائے تو تملکت کی آواز بے سود ٹھہرے۔ صحراؤں میں ناقہ و محمل کی کہانی کا عنوان ضیاع کی نذر ہو جائے۔ شام کے تبہ خانوں میں مسجوں کی قیام گاہ اور صبحوں میں آنچل میں پھپی کرنوں کا خلل کروٹ کروٹ میں کسی حسن کا در ڈھونڈے۔ پرستانوں میں حاجت کی فاقہ کشی اور فاقہ کشی میں امید کے چندراستے، ان راستوں پر بھٹکے ہوئے کچھ فرشتے، ان فرشتوں سے مانگی ہوئی ایک زندگی، جو یکسم خدائے ازل واحد۔ زندگی میں تخلیق کی بھیٹی، اس میں جھونکے گئے الفاظ کی قدآوری اور تیز ہوتی سانسوں میں، حرفوں کے خاندان کھپا دیئے گئے، بعد ازاں بادلوں کی لقب کشائی کے۔ کسی وصال کو دی گئی آواز، اس میں ایک نام، نام میں شاعری کا گندھا ہوا لہجہ اور لہجے سے جنم لیتا ہوا ایک شاعر۔

کیفی اعظمی، خطِ نستعلیق سا شاعر

وہ شاعر جو قیامت کو نہیں قامت کو تراش گیا، وہ شاعر جو لمحوں کو اپنائیت سونپ گیا، وہ شاعر جو وصل کو شیرینی میسر کر گیا، وہ شاعر جو دلربائی کو زیبائی اور زیبائی کو رعنائی سے ہمکنار کر گیا۔ وہ شاعر جو مرمریں لبوں کی پذیرائی میں عمر چند ساعتی کو بسار گیا۔ وہ شاعر جو شگوفوں کو پھول کر گیا۔ وہ شاعر جو مدتوں کا سے پیاسی شعر کی دھرتی پر ابرِ برسات بن کر برس گیا۔ وہ شاعر جو حرمت ہجر پر جنونی طبع کو وار گیا۔ وہ شاعر جو اپنی پلکوں کو اپنی ذات کا آنسو سونپ گیا۔ وہ شاعر جو گرمیٔ عشق کی ایک رات میں پوری زندگی جی گیا۔ وہ شاعر جو محبت نہ سہی نفرت کے آسرے پر سانسوں کو رکھ گیا۔ وہ شاعر جو ایک لمحے کے قلم کا سہ باب ڈھونڈتا عمر کو پہنچ گیا۔ وہ شاعر جو بھنوروں سے کلیوں کی صلح کراتا ہوا صحراؤں کا رزق ہو گیا۔ وہ شاعر جو ویرانوں کو میراث سمجھتا تھا، تنہائیوں پر ذیرا رکھتا تھا، بے بسی کو اثاثہ مانتا تھا، بے قراری کو حسنِ جاں کا پہناوا گانتا تھا، آہوں کو پلو سے باندھ رکھتا تھا، آنسوؤں کی پذیرائی میں سربستہ رہتا تھا، پیاس کی جھولی میں اپنی ذات کا جھرنا انڈیلنا چاہتا تھا، دلوں کے درد بانٹنے نکلا تھا، پُرخار روؤں میں بسیرا رکھتا تھا، اپنا انداز نوٹ چھوٹ کو دان کرنے والا تھا، کسی مہ جبین کی خاطر عمر کا راستہ چھوڑ دینے والا تھا، نفسِ خیز درد میں محو رہنے والا تھا، قدرت سے نامطمئن رہنے والا تھا، وہ شاعر تھا، وہ تو شاعر تھا، ہاں وہ شاعر تھا۔

اپنی قدموں کی آہٹ سے نامانوس رہنا..... اپنی سانسوں سے نا آشنا..... اپنی چاہت سے پرے ہونا..... گنتی کے لمحوں پر چاک ہونا..... اذیت میں کھونا..... خواب کو ادھیڑنا..... نیندوں کو متواذ کرنا..... راتوں کو سیاہی بخشنا..... چاند کو ماہتابیوں دستیاب کرنا..... نہروں میں لہریں ڈالنا..... گیت میں لمس گھولنا..... گالبیت میں خوشبوئیں رچانا..... ستار میں سُر ملانا..... طبلے کی تھاپ پر رقص ہو جانا..... ہجر کو شعر کر دینا..... وصل پہ قربان ہو جانا..... شعر میں امر ہو جانا..... امر ہونا شاعر کا امر واقعہ ہوتا ہے.....

کیفی اعظمی کی سرمستی میں دفتری نہیں تھی۔ ان کی گویائی میں گلگلی نہیں تھی۔ ان کی تجنتی پر سفیدی نہیں تھی۔ ان کی روشنی میں جھونائی نہیں تھی۔ ان کی عاجزی میں ڈھٹائی نہیں تھی۔ ان کی خاکساری میں لاچاری نہیں تھی۔ ان کی چاندنی میں ان کی زندگی نہیں تھی۔ اور ان کی شاعری میں تشنگی نہیں تھی۔

وہ لکھنے والے تھے۔ لکھنے بیٹھتے تو لفظ سر پہ خم قطار اندر قطار۔ وہ بولتے تھے۔ لہجے میں سرمئی آہنگ۔ بچھتا چلا جاتا۔ وہ دفتر میں داخل ہوتے۔ کرسی اور میز کی سانسیں رواں ہو جاتی، کرسی اور میز اس شام سے اگلی صبح تک کا فاصلہ کیسے طے کرتے تھے یہ وہی جانتے تھے۔ لیکن اب وہ انتظار میں نہیں جی رہے۔ وہ تو اس کی روح کے ساتھ امر ہو چکے ہیں۔ وہ مجذوب ہو چکے ہیں۔ وہ کیفی اعظمی ہو چکے ہیں۔ فلم کی گیت نگاری ان کی زندگی کا اہم حصہ مانی جاتی ہے۔ وہ واحد گیت نگار تھے، جن کو موسیقار ثمر بنا کے دیتے، وہ وہاں بیٹھے بیٹھے، ان سُروں کو الفاظ عطا کرتے چلے جاتے۔ وہ غزل لے کے بیٹھتے، غزل کی مکانیں سات آسمانوں تک کی بلندی طے کر آتیں۔ وہ نظم کو کینوس پر بچھانا شروع کرتے، نظم سات زمینوں کے دریا پانٹھ آتی۔ وہ گیت کے گلدان میں لفظوں کو سجانے کا ارادہ باندھتے، گیت کی باچھیں کھل جاتیں۔ وہ شعر پر جادوگری نہیں، سامراجی نہیں، عشقتیت کرتے تھے۔

ادب کی ٹوٹتی سانسوں کو کیفی اعظمی نصیب ہوا، ادب کی امید بحال ٹھہری، شاعری کو کیفی اعظمی ملا، شاعری کو ٹپ زفاف میسر ہوئی، غزل کو کیفی اعظمی دستیاب ہوا تو غزل بیوہ ہونے سے بال بال بچی۔ نظم کو کیفی اعظمی نے وصال کا شرف بخشا تو نظم کی بے اولادی ختم ہوئی۔ کیفی اعظمی ورثۂ شعر کے حاکم سوم مانے جاتے ہیں۔ وہ لفظوں کے حسن سے زیب تن تھے۔ وہ پوشاک میں شاعریت لے کے چلتے تھے۔ وہ سرتا پا شاعری کے ملبوس میں لپٹے تھے۔

لیکن.....

وہ نو بہار شعر کا دبستان..... ویران ہو گیا، وہ جو سوچ کر اٹھا تھا کہ کوئی منا لے گا، اس کا دامن پکڑنے والے ہاتھوں کو ترس گیا، اس کے اٹھتے قدم آواز کو ترس کر رہ گئے، وہ جو امید میں تھا کہ کوئی روک لے گا، قدم بہ قدم آگے نکلتا چلا گیا۔ محفل سے دور..... کہیں بہت..... دامن پکڑنے کو ہاتھ اب ترستے رہیں گے، قدموں کے لیے ہر آواز ویران ہی رہے گی، روکنے والا پچھتاوے کے الاؤ پر عمر بتائے اب..... وہ تو چلا گیا..... جدا ہو گیا.....







جہانِ ادب

قتیل شفائی

زیرِ عشق شعر میں ڈھالنے والا بے مثال غزل گو

11 جولائی۔ 9ویں برسی پر خصوصی تحریر

سعدیہ قریشی

قتیل کا سارا سفر گہرے عشق کی پاتال میں ملے ہوا۔ وہ اپنی ذات میں نیلام ہوتا رہا، غمِ حیات نے اسے زرِ عشق کے بدلے خرید لیا اور پھر یہی زرِ عشق اس کے احساس کی بھٹی میں تپ کر شعروں کے کندن میں ڈھلتا رہا۔ وہ تمام عمر وادیٔ عشق کا مسافر رہا اور زندگی کی آخری سانس تک اسی سرشاری میں گم اگلے جہاں سدھار گیا۔ اسی لیے اس کی وفات پر کسی نے کہا۔ ”آپ کا قتیل شفائی مر گیا ہے، میرا قتیل ہمیشہ زندہ رہے گا۔“ (ان کا انتقال 11 جولائی 1991ء کو ہوا تھا)۔

اور اس میں شک بھی کیا کہ قتیل اپنے اشعار کے آئینے میں آج بھی زندہ ہے۔ اردو ادب کو لازوال اشعار۔ ضرب المثل کی طرح زبان زدِ عام ہونے والے مصرعے اور سدا کانوں میں رس گھولنے والے گیت اور غزلیں دینے والا فنکار کبھی مر نہیں سکتا۔ قتیل شفائی کے شعری اثاثے پر نظر ڈالیں تو ایسا لگتا ہے جیسے اس کی روح کا خمیر ہی شعر، خطابت اور موسیقی سے اٹھا تھا۔ اس کی سوچ شاعری تھی۔ اس کا احساس نغمہ اور خیال گیت تھا۔ قتیل شفائی ایک شاعر کا نام نہیں ایک پورا عہد ہے شاعری کا۔ اسی لیے فیض احمد فیض نے قتیل کو مطرب، نغمہ گر، نغمہ سنج اور شیریں گفتار کہا۔

فیض نے کہا کہ قتیل شفائی ترقی پسند شعرا کے قافلے میں اہلِ قافلہ کے ہمسفر بھی ہیں اور ان سے جدا بھی۔ گرجذباتی اور نظریاتی معاملات میں ان کے دل و دماغ ان کے ساتھ آہنگ ہے تو انفرادیت اور تخیل کے معاملات میں قتیل کی آواز منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔“

قتیل کی شاعری میں رچاؤ، سبھاؤ، مٹھاس، گھلاوٹ، اظہار کی دلکشی اور سچے جذبوں کی آنچ پر اس طرح دمکتی نظر آتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے۔ ان اشعار کو کہنے والا فنکار تمام تر سچائی اور دیانت سے اپنے دل کی کیفیات کو شعروں میں ڈھالتا رہا۔ قتیل کے اشعار میں ہمیں اس کی زندگی سانس لیتی، چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ ادب کا آدم جی ایوارڈ حاصل کرنے والی اکتیس نظموں پر مشتمل کتاب ”مطربہ“ وقت کی ممتاز منفیہ کے ساتھ قتیل کے عشق کی کہانی ہے۔ قتیل ایک سچا اور خالص تخلیق کار تھا۔ جس نے اپنی شخصیت پر منافقت کے لبادے نہیں چڑھائے۔ زندگی نے جو زرِ عشق اسے عطا کیا قتیل نے اسے شعروں کے کندن میں ڈھال دیا اسی لئے ضرب المثال کی طرح مقبول یہ مصرعہ بھی قتیل ہی کے قلم سے نکلا۔

لاکھ پردوں میں رہوں میرے کہوتی ہے
بھید سچ بولتی ہے
شاعری ہے

کسی شاعر کا اگر ایک بھی شعر زبان زدِ عام ہو جائے تو وہ اسے تمام عمر کے تخلیقی کرب کا صلہ سمجھتا ہے۔ مگر قتیل شفائی کے ہاں تو سیکڑوں اشعار ایسے پڑھنے کو ملتے ہیں جو زبان زدِ عام ہیں۔ اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں ان کا استعمال کرنے والے بیشتر لوگ اس کے خالق کو نہیں جانتے۔ مثلاً چند اشعار دیکھئے۔

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِعام رکھ دیا
اک خاص حد پہ آنکھی جب تیری بے رخی
نام اس کا ہم نے گردشِ ایام رکھ دیا

اور

گرمیٔ حسرتِ ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں
خود نمائی تو نہیں شیوۂ ارباب وفا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں
جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں
بڑھا کے پیاس میری اس نے ہاتھ چھوڑ دیا
وہ کر رہا تھا مروت بھی دل لگی کی طرح

اور۔

لفظ چھوٹا ہوں مفہوم بدل جاتے ہیں
اک نہ اک خوف بھی ہے جرأت اظہار کے ساتھ

اور مقبول شعر دیکھئے کہ

دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

قتیل شفائی ایک بے مثال غزل گو شاعر تھا۔ اپنی بحر پور اور مضبوط غزل کے بل بوتے پر قتیل ادبی گروہ بندیوں کی بیساکھیوں کے بغیر مقبول ہوا۔ اور ادب کے دونوں بڑے گروہوں سے قتیل کو محبت اور پیار ملا۔ تاہم احمد ندیم قاسمی کو ہمیشہ قتیل نے ایک بڑے اور مہربان اور استاد کا درجہ دیا۔

قتیل شفائی کے کام کا ایک اہم حصہ اس شاعری پر مشتمل ہے جسے فلموں میں نغمایا گیا۔ کئی گیت اور غزلیں قتیل نے فلموں کے لیے بھی لکھیں۔ 50 کی دہائی کا وسط اور اسی کی دہائی تک فلمی گیت اور غزلیں جو مقبول ہوئے، اور آج بھی سماعتوں میں رس گھولتے ہیں۔ وہ قتیل شفائی ہی کے قلم کا شکار ہیں۔ اعلیٰ درجے کے فلمی گیت اور غزلیں۔ ایک ایسے پارس کی طرح تھے جن کی دھن کو کندن کرنے والے، جنہیں گانے والے بھی شہرت کی بلندیوں پر پہنچے۔

لازوال گیتوں اور غزل کی ایک بھی فہرست ہے۔ جس میں سے چند اس طرح سے ہیں۔

زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں
میں تو مر کے بھی میری جان تمہیں چاہوں گا

غم دل کو ان آنکھوں سے چھلک جانا بھی آتا ہے

تمہاری انجمن سے اٹھ کر دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

زندہ ہیں کتنے لوگ محبت کیے بغیر

چلو اچھا ہوا تم بھول گئے

کیوں ہم سے خفا ہو گئے اے جانِ تمنا
بھیگے ہوئے موسم کا مزا کیوں نہیں لیتے

دنیائے موسیقی کے عظیم موسیقار خواجہ خورشید انور نے قتیل شفائی کے گیتوں کے بارے میں کہا ”قتیل شفائی اپنے فن کے لیے نادیدہ راستے تلاش کرتے ہیں۔ جن پر پہلے کسی نے قدم نہ رکھا ہو۔ میں ان کے گیتوں کو اپنی دھنوں میں ڈھالتا ہوں تو مجھے وہی سکون ملتا ہے جو ہر تخلیق کے بعد اس کا خالق محسوس کرتا ہے۔“

قتیل کی سوانح عمری ”گھنگرو ٹوٹ گئے“ کے عنوان سے چھپی۔ وہ اپنی زندگی کے سفر کو یوں یاد کرتے جاتے اور ان کے شاگرد نعیم چشتی اسے قلمبند کرتے۔ معروف ادبی شخصیت اظہر جاوید قتیل شفائی کے رازدان دوست تھے ان کی زندگی کی بیشتر شامیں اکٹھے گزریں۔

اظہر جاوید اپنے دوست قتیل شفائی بارے کہتے ہیں۔ میں نے زندگی کے چالیس برس قتیل کے ہمراہ گزارے۔ وہ یا تو خود تخلیق کے دفتر میں آجاتے یا مجھے اپنے پاس بلا لیتے۔ وہ ایک دوست نواز شخص تھا۔ ہر شام اپنے دوستوں کو کھانے پر بلاتا۔ وہ کبھی تنہا رات کا کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ اسی لیے جب قتیل کا جنازہ اٹھا تو ایک غمزدہ نے کہا ”آج لاہور سے ایک مہمان نواز شخص کا جنازہ اٹھا ہے۔“ ان کی بیماری کے دنوں میں ہر شام ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اپنا کلام وہ اپنے چند قریبی دوستوں کو سنایا کرتے تھے۔ مشاعروں پر جاتے مگر ہر محفل میں اپنی غزلیں سنانے سے گریز کرتے۔ ان کی ایک دلچسپ عادت یہ تھی کہ وہ کلپ بورڈ پر کاربن پیپر رکھ کر لکھتے تھے۔ وہ بہت بڑا شاعر، بہت پیارا دوست تھا۔“

قتیل شفائی کی ایک یادگار غزل

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گریں اور زخم آئے مجھے
وہ مہرباں ہے تو اقرار کیوں نہیں کرتا
وہ بدگماں ہے تو سوہار آزمائے مجھے
میں گھر سے تیری تمنا پہن کے جب نکلوں
برہنہ شہر میں کوئی نظر نہ آئے مجھے
وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے
میں اپنی ذات میں نیلام ہو رہا ہوں قتیل
غمِ حیات سے کہہ دو خرید لائے مجھے!

”قتیل شفائی کا شعری اثاثہ“

مطربہ (نظمیں)، گھنگرو، مونالیزا، برشگال، صنم، گھنگرو، پرچم، ابابیل، ہریالی، جھومر، آموختہ، بگجر، نذرانہ، برگد، گھنگرو (گیت)، سمندر میں سیڑھی (نظمیں)، گھنگرو ٹوٹ گئے (سوانح عمری)

ابا جان گنگناتے ہوئے شعر کہتے تھے: نوید قتیل

ہم نے ہمیشہ ابا جان کو رات گئے تک لکھتے اور پڑھتے دیکھا۔ غزل کی آمد کا تو کوئی وقت نہیں ہوتا مگر لکھتے عموماً وہ رات کو تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے اشعار گنگنا رہے ہوتے۔ ہم بہن بھائی اس وقت ان کے کمرے میں مداخلت سے گریز کرتے تھے۔

ابا جان۔ خوش لباس، خوش خوراک اور دوست کے دوست تھے۔ گھر پر عموماً دوستوں کو کھانے پر مدعو کرتے۔ میں نے بچپن میں اپنے گھر فیض احمد فیض، منیر نیازی، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی جیسے بڑے ادیبوں کو دیکھا۔ اس کے علاوہ اٹلی سے بھی ابا کے دوست شاعر اور ادیب ہمارے ہاں آتے تھے۔ پانچ بہن بھائیوں میں، میں سب سے چھوٹا تھا اور ابا جان کا بہت لاڈلا۔ ان کا ہمارے ساتھ دوستانہ والا رویہ ہوتا۔ ابا جان کے کہنے پر میں نے ان کے فلمی گیتوں کو ایک کتاب ”رنگ“ میں اکٹھا کیا۔

اورنگزیب خان سے قتیل شفائی تک

ہری پور ہزارہ 24 دسمبر، اورنگزیب خان کی پیدائش، بعد ازاں نام قتیل شفائی قلمی نام رکھا۔ شفائی کو اپنے استاد حکیم محمد شفائی کے ساتھ عقیدت کی بنیاد پر نام کا حصہ بنایا۔ والد کی جلد وقات، غم روزگار کا بوجھ، راولپنڈی کا سفر، فرنٹیئر ٹرانسپورٹ کمپنی میں کام، 60 روپے ماہانہ پہلی تنخواہ۔ 1946ء میں لاہور آمد۔ ادب لطیف کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی نوکری۔ فلمی گانے لکھنے کا آغاز۔ 50 کی دہائی میں۔ ڈھائی ہزار گیت۔ 18 شاعری مجموعے۔ 1994ء میں پرائڈ آف پرفارمنس، اٹھارہ میں بے پناہ پذیرائی۔ امیر خسرو ایوارڈ ملا۔ پاکستان کے تمام بڑے ادبی ایوارڈ حاصل ہوئے مگر اس سے زیادہ شعری ذوق رکھنے والے دنیا بھر میں اردو کے قارئین کی بے پناہ محبت۔ قتیل شفائی کا کل اثاثہ زندگی!

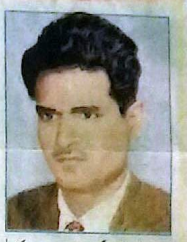


شاعری

کروں طلاقِ بہار کب تک
رہوں یونہی بے قرار کب تک
خدارا مجھ کو بھی کچھ بتاؤ
ہنسیں گی مجھ پر یہ خار کب تک
مرے لہو کو شفق سمجھ کر
افق افق جگمگانے والو
بنے ہیں سرخی جو اس شفق کی
کروں میں ان کا شمار کب تک
تڑپ رہے ہیں جو گل ہنسی کو
ترس رہی ہے کلی نمو کو
چمن میں ہے کچھ عجیب ہلچل
کہ ہو رہے ہیں طیور بے کل
ہتھیں گی پابند بجلیاں کب
رہیں گے رقصاں شرار کب تک
ہمارا مذہب ہمارا ایماں پکارتا ہے
کہاں ہے انساں
رہے گا قحط الرجال کب تک
گرے گا اپنا معیار کب تک

نجمہ یاسمین یوسف

شکیب جلالی کی منتخب غزلیں



شکیب جلالی کا اصل نام سید حسن رضوی تھا اور وہ یکم اکتوبر 1934ء کو اتر پردیش کے علی گڑھ کے ایک قصبے سیدانہ جلال میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے شعور کی آنکھیں بدایوں میں کھولیں جہاں ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں تعینات تھے۔ لیکن والدہ کی حادثاتی موت نے سید حسن رضوی کے ذہن پر کچھ ایسا اثر ڈالا کہ وہ شکیب جلالی بن گئے۔ انہوں نے 15 یا 16 سال کی عمر میں شاعری شروع کردی اور شاعری بھی ایسی جو لوہا منوا چکی تھی جس میں آتش کدے کی تپش تھی۔ شکیب جلالی پہلے راولپنڈی اور پھر لاہور آگئے یہاں سے انہوں نے ایک رسالہ ''جاوید'' نکالا۔ لیکن چند شماروں کے بعد ہی یہ رسالہ بند ہوگیا۔ پھر ''مغربی پاکستان'' نام کے سرکاری رسالے سے وابستہ ہوئے۔ مغربی پاکستان چھوڑ کر کسی اور اخبار سے وابستہ ہوگئے۔ تعلقات عامہ کے محکمے میں بھی انہیں ایک ذمہ دارانہ ملازمت مل گئی۔ لیکن وہ ان سب چیزوں سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کی شاعری ویسے ہی شعلہ فشانی کرتی رہی اور پھر احساسات کی اس تپش کے آگے انہوں نے سپر ڈال دی اور محض بتیس سال کی عمر میں سرگودھا اسٹیشن کے پاس ایک ریل کے سامنے کود کر خودکشی کرلی اور اس طرح شعلوں سے لبھاتے ہوئے ایک شاعر کا خاتمہ ہوگیا۔

موت کے بعد ان کی جیب سے یہ شعر ملا:

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہیں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اُس پیڑ کے پھل تھے، پسِ دیوار گرے

ایسی دہشت تھی فضاؤں میں کھلے پانی کی
آنکھ جھپکی بھی نہیں، ہاتھ سے پتوار گرے

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں پہ گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

تیرگی چھوڑ گئے دل میں اجالے کے خطوط
یہ ستارے مرے گھر ٹوٹ کے بیکار گرے

کیا ہَوا ہاتھ میں تلوار لئے پھرتی ہے
کیوں مجھے ڈھال بنانے کو یہ چھتنار گرے

دیکھ کر اپنے در و بام لرز جاتا ہوں
میرے ہمسائے میں جب بھی کوئی دیوار گرے

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے
کس گھڑی سر پہ لٹکتی ہوئی تلوار گرے

ہم سے ٹکرا گئی خود بڑھ کے اندھیرے کی چٹان
ہم سنبھل کر جو بہت چلتے تھے، ناچار گرے

☆.....☆.....☆

آتا ہے ہر چڑھائی کے بعد اک اتار بھی؟
پستی سے ہم کنار ملے کوہسار بھی؟

دل کیوں دھڑکنے لگتا ہے اُبھرے جو کوئی چاپ
اب تو نہیں کسی کا مجھے انتظار بھی!

جب بھی سکوتِ شام میں آیا ترا خیال
کچھ دیر کو ٹھہر سا گیا آبشار بھی

کچھ ہو گیا ہے دھوپ سے خاکستری بدن
کچھ جم گیا ہے راہ کا مجھ پر غبار بھی

اس فاصلوں کے دشت میں رہبر وہی بنے
جس کی نگاہ دیکھ لے صدیوں کے پار بھی

اے دوست، پہلے قرب کا نقشہ عجیب تھا
میں سن سکا نہ اپنے بدن کی پکار بھی

رستہ بھی واپسی کا کہیں بن میں کھو گیا
اوجھل ہوئی نگاہ سے ہرنوں کی ڈار بھی

کچھ عقل بھی ہے باعثِ توقیر اے شکیبؔ
کچھ آ گئے ہیں بالوں میں چاندی کے تار بھی

☆.....☆.....☆

آگ کے درمیان سے نکلا
میں بھی کس امتحان سے نکلا

پھر ہوا سے سلگ اٹھے پتے
پھر دھواں گلستان سے نکلا

جب بھی نکلا ستارہ امید
کہر کے درمیان سے نکلا

چاندنی جھانکتی ہے گلیوں میں
کوئی سایہ مکان سے نکلا

شکر ہے اس نے بے وفائی کی
میں کڑے امتحان سے نکلا

لوگ دشمن ہوئے اسی کے شکیبؔ
کام جس مہربان سے نکلا

☆.....☆.....☆

اب آپ رہِ دل جو کشادہ نہیں رکھتے
ہم بھی سفرِ جاں کا ارادہ نہیں رکھتے

پینا ہو تو اک جرعۂ زہراب بہت ہے
ہم تشنہ دہن تہمتِ بادہ نہیں رکھتے

یہ گردِ رہِ شوق ہی جم جائے بدن پر
رسوا ہیں کہ ہم کوئی لبادہ نہیں رکھتے

ہر گام پہ جگنو سا چمکتا ہے جو دل میں
ہم اس کے سوا مشعلِ جادہ نہیں رکھتے

سرخی نہیں پھولوں کی تو زخموں کی شفق ہے
دامانِ طلب ہم کبھی سادہ نہیں رکھتے

☆.....☆.....☆

اس خاکداں میں اب تک باقی ہیں کچھ شرر سے
دامن بچا کے گزرو یادوں کی رہگزر سے

ہر ہر قدم پہ آنکھیں تھیں فرشِ راہ لیکن
وہ روشنی کا ہالا اُترا نہ بام پر سے

کس دشت کی صدا ہو، اتنا مجھے بتا دو
ہر سو بچھے ہیں رستے، آؤں تو میں کدھر سے

اجڑا ہوا مکاں ہے یہ دل، جہاں پہ ہر شب
پرچھائیاں لپٹ کر روتی ہیں بام و در سے

☆.....☆.....☆

اب میسّر نہیں فرصت کے وہ دن رات ہمیں
لے اُڑی جانے کہاں صرصرِ حالات ہمیں

آج وہ یوں نگہِ شوق سے بچ کر گزرے
جیسے یاد آئے کوئی بھولی ہوئی بات ہمیں

کیسے اڑتے ہوئے لمحوں کا تعاقب کیجے
دوستو اب تو یہی فکر ہے دن رات ہمیں

نہ سہی کوئی، ہجومِ گل و لالہ نہ سہی
دشت سے کم بھی نہیں کنجِ خیالات ہمیں

وہ اگر غیر نہ سمجھے تو کوئی بات کریں
دلِ ناداں سے بہت سی ہیں شکایات ہمیں

دھوپ کی لہر ہے تو، سایۂ دیوار ہیں ہم
آج بھی ایک تعلق ہے ترے سات ہمیں

رنگ و مستی کے جزیروں میں لیے پھرتے ہیں
اس کی پائل سے چرائے ہوئے نغمات ہمیں

☆.....☆.....☆

اب یہ ویران دن کیسے ہوگا بسر
رات تو کٹ گئی درد کی سیج پر

بس یہیں ختم ہے پیار کی رہگزر
دوست اگلا قدم کچھ سمجھ سوچ کر

اس کی آواز یا تو بڑی بات ہے
ایک پتہ بھی کھڑکا نہیں رات بھر

گھر میں طوفان آئے زمانہ ہوا
اب بھی کانوں میں بجتی ہے زنجیرِ در

اپنا دامن بھی اب تو میسّر نہیں
کتنے ارزاں ہوئے آنسوؤں کے گہر

یہ شکستہ قدم بھی ترے ساتھ تھے
اے زمانے ٹھہر، اے زمانے ٹھہر

اپنے غم پر تبسّم کا پردہ نہ ڈال
دوست، ہم ہیں سوار ایک ہی ناؤ پر

☆.....☆.....☆

اتر گیا تن نازک سے پتیوں کا لباس
کسی کے ہاتھ نہ آئی مگر گلاب کی باس

اب اپنے جسم کے سائے میں تھک کے بیٹھ رہو
کہیں درخت نہیں راستے میں دور نہ پاس

ہزار رنگ کی ظلمت میں لے گئی مجھ کو
بس اک چراغ کی خواہش بس اک شرار کی آس

تمہارے کام نہ آئے گا جو بھی دانا ہے
ہر ایک شخص پہ کیوں کر رہے ہو اپنا قیاس

کسی کی آس تو ٹوٹی کوئی تو ہار گیا
کہ نیم باز دریچوں میں روشنی ہے اداس

وہ کالے کو کی دوری اب ایک خواب سی ہے
تم آ گئے ہو مگر کب نہ تھے ہمارے پاس

یہ کیا طلسم ہے، جب سے کنارِ دریا ہوں
شکیبؔ اور بھی کچھ بڑھ گئی ہے روح کی پیاس

☆.....☆.....☆

اتریں عجیب روشنیاں رات خواب میں
کیا کیا نہ عکس تیر رہے تھے سراب میں

کب سے ہیں ایک حرف پہ نظریں جمی ہوئی
وہ پڑھ رہا ہوں جو نہیں لکھا کتاب میں

یوں آئنہ بدست ملی پربتوں کی برف
شرما کے دھوپ لوٹ آ گئی آفتاب میں

جینے کے ساتھ موت کا ہے ڈر لگا ہوا
خشکی دکھائی دی ہے سمندر کو خواب میں

گزری ہے بار بار مرے سر سے موجِ خشک
ابھرا ہوا ہوں ڈوب کے تصویرِ آب میں

اک یاد ہے کہ چھین رہی ہے لبوں سے جام
اک عکس ہے کہ کانپ رہا ہے شراب میں

چوما ہے میرا نام لبِ سرخ سے شکیبؔ
یا پھول رکھ دیا ہے کسی نے کتاب میں

☆.....☆.....☆

عباس تابش کی منتخب غزلیں

پانی آنکھ میں بھر کر لایا جا سکتا ہے
اب بھی جینا شہر بچایا جا سکتا ہے
ایک محبت اور وہ بھی ناکام محبت
لیکن اس سے کام چلایا جا سکتا ہے
دل پر پانی پینے آتی ہیں امیدیں
اس چشمے میں زہر ملایا جا سکتا ہے
مجھ نادان سے پوچھتے ہیں فرہاد و مجنوں
عشق میں کتنا نام کمایا جا سکتا ہے
یہ مہتاب یہ رات کی پیشانی کا گھاؤ
ایسا زخم تو دل پر کھایا جا سکتا ہے
پھٹا پرانا خواب ہے میرا پھر بھی تابش
اس میں اپنا آپ چھپایا جا سکتا ہے

☆.....☆.....☆

ساری دنیا میں مرے جی کو لگا ایک ہی شخص
ایک ہی شخص تھا بخدا ایک ہی شخص
ایسا لگتا ہے سبھی عشق کسی ایک سے تھے
ایسا لگتا ہے مجھے ملتا رہا ایک ہی شخص
وہ جو میں اس کی محبت بھی کسی اور سے کی
ان دنوں شہر کا ہر شخص لگا ایک ہی شخص
میں تو اے عشق تری کوزہ گری جانتا ہوں
تو نے ہم دو کو ملایا تو بنا ایک ہی شخص
مجھ سے ناراض نہ ہونا مرے اچھے لوگو!
کیا کروں میری محبت نے پٹایا ایک ہی شخص
تو جو کہتا ہے ترے جیسے کئی اور بھی ہیں
تجھ دعویٰ ہے تو پھر خود سا دکھا ایک ہی شخص
تو جسے چاہتا ہے میں بھی اُسے چاہتا ہوں
اچھا لگتا ہے مجھے تیرے سوا ایک ہی شخص
دوست! سب سے کہاں کھنچتا ہے غزل کا چلہ
حجرۂ میر میں ہوتا ہے سدا ایک ہی شخص

☆.....☆.....☆

دکھتے دن میں عجب لطف اٹھایا کرتا تھا
میں اپنے ہاتھ کا تتلی پہ سایہ کرتا تھا
اگر میں پوچھتا بادل کدھر کو جاتے ہیں
جواب میں کوئی آنسو بہایا کرتا تھا
جو چاند ضعف ہے جس کی زباں نہیں کھلتی
تبھی یہ چاند کہانی سنایا کرتا تھا
میں اپنی ٹوٹتی آواز گانخنے کے لئے
کہیں سے لفظ کا پیوند لایا کرتا تھا
عجیب حسرتِ پرواز مجھ میں ہوتی تھی
میں کاپیوں میں پرندے بنایا کرتا تھا
تلاشِ رزق میں بھٹکے ہوئے پرندوں کو
میں جیب خرچ سے دانہ کھلایا کرتا تھا
ہمارے گھر کے قریب ایک جھیل ہوتی تھی
اور اس میں شام کو سورج نہایا کرتا تھا
یہ زندگی تو مجھے تیرے پاس لے آئی
یہ راستہ تو کہیں اور جایا کرتا تھا

☆.....☆.....☆

نہ تجھ سے ہے گلہ نہ آسمان سے ہوگا
تری جدائی کا جھگڑا جہان سے ہوگا
تمہارے میرے تعلق کا لوگ پوچھتے ہیں
کہ جیسے فیصلہ میرے بیان سے ہوگا
اگر یونہی مجھے رکھا گیا اکیلے
برآمد اور کوئی اس مکان سے ہوگا
جدائی طے تھی مگر یہ کبھی نہ سوچا تھا
کہ تو خدا بھی خداگانہ شان سے ہوگا
گزر رہے ہیں مرے دن اسی تفاخر میں
کہ اگلا قیس مرے خاندان سے ہوگا

☆.....☆.....☆

یار کے غم کو عجب نقش گری آتی ہے
پور پور آنکھ کی مانند بھری جاتی ہے
بے تعلق نہ ہمیں جان کہ ہم جانتے ہیں
کتنا کچھ جان کے یہ بے خبری آتی ہے
اس قدر گوندھنا پڑتی ہے لہو سے مٹی
ہاتھ گھل جاتے ہیں پھر کوزہ گری آتی ہے
کتنا رکھتے ہیں وہ اس شہرِ خموشاں کا خیال
روز ایک ناؤ گلابوں سے بھری آتی ہے
زندگی کیسے بسر ہوگی کہ ہم کو تابش
صبر آتا ہے نہ آشفتہ سری آتی ہے

☆.....☆.....☆

ہنسنے نہیں دیتا کبھی رونے نہیں دیتا
یہ دل تو کوئی کام بھی ہونے نہیں دیتا
تم مانگ رہے ہو مرے دل سے مری خواہش
بچہ تو کبھی اپنا کھلونا نہیں دیتا
میں آپ اُٹھاتا ہوں شب و روز کی ذلت
یہ بوجھ کسی اور کو ڈھونے نہیں دیتا
وہ کون ہے اس سے تو میں واقف بھی نہیں ہوں
جو مجھ کو کسی اور کا ہونے نہیں دیتا

☆.....☆.....☆

تیرے گمنام اگر نام کمانے لگ جائیں
شرف و شیوہ و تسلیم ٹھکانے لگ جائیں
جس طرح نور سے پیدا ہے جہانِ اشیاء
اک نظر ڈال کے ہم بھی نظر آنے لگ جائیں
یہ بھی ممکن ہے کوئی روکنے والا ہی نہ ہو
یہ بھی ممکن ہے یہاں مجھ کو زمانے لگ جائیں
دیکھ اے حسنِ فراواں یہ بہت ممکن ہے
میرا دل تک نہ لگے تیرے خزانے لگ جائیں
جس کے ہونے سے ہے مشروط ہمارا ہونا
اپنے ہونے کا نہ احساس دلانے لگ جائیں
تو محبت کی غرض لمحہ موجود سے رکھ
ترے ذمے نہ مرے درد پرانے لگ جائیں
یہ محبت نہ کہیں روگ مکمل بن جائے
ہم ترے بعد کوئی ظلم نہ ڈھانے لگ جائیں
کارِ دنیا بھی عجب ہے کہ مرے گھر والے
دن نکلتے ہی میری خیر منانے لگ جائیں
پاس ہی ڈوب رہی ہے کوئی کشتی تابش
خود نہیں بچتے اگر اس کو بچانے لگ جائیں

☆.....☆.....☆

اتنا آساں نہیں مسند پہ بٹھایا گیا میں
شہرِ تہمت تیری گلیوں میں پھرایا گیا میں
یہ تو اب عشق میں جی لگنے لگا ہے کچھ کچھ
اس طرف پہلے پہل گھیر کے لایا گیا میں
خوف اتنا تھا کہ دیوار پکڑ کر نکلا
اس سے ملنے کے لئے صورتِ سایہ گیا میں
تجھ سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں تھی ورنہ
ایک مدت تری دہلیز تک آیا گیا میں
خلوتِ خاص میں بلوانے سے پہلے تابش
عام لوگوں میں بہت دیر بٹھایا گیا میں

☆.....☆.....☆

اے دوست دعا اور مسافت کو بہم رکھ
یہ میری ہتھیلی ہے یہاں پہلا قدم رکھ
ایسے تو زمانہ مجھے جینے نہیں دے گا
میں کچھ بھی نہیں تیرا مگر میرا بھرم رکھ
اس بات پہ دنیا سے میری بنتی ہی نہیں ہے
کہتی ہے کہ تلوار اُٹھا اور قلم رکھ
میں جب بھی کہیں راہ میں گرنے لگا تابش
آواز سی آئی مرے قدموں پہ قدم رکھ

☆.....☆.....☆

یہ ان دنوں کا ذکر ہے اک بادشاہ تھا
جس کی نظر میں زندگی کرنا گناہ تھا
شوقِ مراجعت کی وہاں اڑ رہی تھی خاک
کشتی جلی ہوئی تھی کنارہ سیاہ تھا
میں اس کے ساتھ پھرتا تھا قصرِ قدیم میں
اس دوستی کا ایک کبوتر گواہ تھا
بیٹھا تھا اس پہ چاند کسی چیل کی طرح
کتنا بلند شہر میں نخلِ گناہ تھا
ٹوٹے پروں کا تاج مری یادگار ہے
اے کج کلاہ میں بھی کبھی کج کلاہ تھا
اہلِ حکم کو میری ضرورت تھی جن دنوں
تکیہ فقیر کا مری آماجگاہ تھا

☆.....☆.....☆

تو پرندے مار دے سرو و صنوبر مار دے
تیری مرضی جس کو دہشت گرد کہہ کر مار دے
تیرا اس کے ماننے والوں سے پالا پڑ گیا
جو پرندے بھیج کر لشکر کے لشکر مار دے
تم بھی موسیٰ کے تعاقب میں چلے تو آئے ہو
دیکھنا تم کو نہ یہ نیلا سمندر مار دے
تو نے جس کے ڈھونڈنے کو بھیج دی اتنی سپاہ
یہ نہ ہو وہ تجھ کو تیرے گھر کے اندر مار دے
اس کو کیا حق ہے یہاں بارود کی بارش کرے
اس کو کیا حق ہے مرے رنگے کبوتر مار دے
روشنی کے واسطے پندار کا سودا نہ کر
سامنے سورج بھی ہے تو اس کو ٹھوکر مار دے
گونج تو بھی اس کے لہجے میں پہاڑوں کی طرح
تابش اس کی بات تو بھی اس کے منہ پر مار دے

☆.....☆.....☆

لوگ جائیں یا ترا پیچھا کریں
ہر قدم پہ سوچتے ہیں کیا کریں
یا ہماری تلخ باتوں کو سہار
یا بتا دے کس سے ہم جھگڑا کریں
ڈھونڈتے تو ہم بھی ہیں راہِ فرار
سوچتے تو ہم بھی ہیں اب کیا کریں
ایک مدت ہو گئی روئے ہوئے
یار مجلس ہی کوئی برپا کریں
اپنی مرضی سے گزاریں زندگی
دن میں سوئیں رات میں جاگا کریں
چھوڑنے کو چھوڑ دیں دنیا مگر
اتنے سارے دوستوں کا کیا کریں
شہر کو شورِ قیامت چاہئے
یار یہ دو چار چڑیاں کیا کریں
آپ کو آخر یہ حق کس نے دیا
آپ اہلِ دل کو کیوں رسوا کریں
تم مکمل بات پہ خاموش ہو
لوگ تو پورا مرا جملہ کریں
یہ سمندر تو اُگل دیتا ہے لاش
قصد کرنا ہے تو صحرا کیا کرے
قیس مل جائے تو پوچھیں مرشدا
عشق کرنا چھوڑ دیں ہم کیا کریں

☆.....☆.....☆

خواجہ میر دردؔ کی منتخب شاعری



دردؔ کا نام سید خواجہ میر اور 'دردؔ' تخلص تھا۔ ان کے والد کا نام خواجہ محمد ناصر تھا جو فارسی کے اچھے شاعر تھے اور عندلیبؔ تخلص کرتے تھے۔ خواجہ میر دردؔ دہلی میں 1720ء میں پیدا ہوئے اور ظاہری و باطنی کمالات اور جملہ علوم اپنے والد سے حاصل کیے۔ درویشانہ تعلیم نے روحانیت کو جلا دی اور تصوف کے رنگ میں ڈوب گئے۔ آغاز جوانی میں سپاہی پیشہ تھے۔ پھر دنیا ترک کی اور والد صاحب کے انتقال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ دردؔ نے شاعری اور تصوف ورثہ میں پائے۔ ذاتی تقدس، خودداری، ریاضت و عبادت کی وجہ سے امیر غریب بادشاہ فقیر سب ان کی عزت کرتے تھے۔ وہ ایک باعمل صوفی تھے اور دولت و ثروت کو ٹھکرا کر درویش گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ان کے زمانے میں دہلی ہنگاموں کا مرکز تھی چنانچہ وہاں کے باشندے معاشی بدحالی، بے قدری اور زبوں حالی سے مجبور ہو کر دہلی سے نکل رہے تھے لیکن دردؔ کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی اور وہ دہلی میں مقیم رہے۔ دردؔ نے 1785ء میں وفات پائی اور وہی تکیہ جہاں تمام عمر بسر کی تھی مدفن قرار پایا۔ دردؔ کو بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ متعدد تصانیف لکھیں جو فارسی میں ہیں۔ نظم میں ایک دیوان فارسی اور ایک دیوان اردو میں ہے۔

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً ، لیکن
میں جو پہنچا تو کہا : خیر ! یہ مذکور نہ تھا

باوجود ویکہ پر وبال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

پرورش غم کی ترے یاں تئیں تو کی دیکھا
کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا

محتسب ! آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی جو شیشے کی طرح چور نہ تھا

درد کے ملنے سے اے یار ! برا کیوں مانا
اس کو کچھ اور، سوا دید کے، منظور نہ تھا

☆.....☆.....☆

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس ! جی گھبرا گیا

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے ، جز جفا
پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری
جی میں یہ کس کا تصور آگیا

میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

پی گئی کتوں کا لوہو تیری یاد
غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا

مٹ گئی تھی اس کے جی سے تو جھجک
درد کچھ بک بک کے تو چونکا گیا

☆.....☆.....☆

تجھی کو جو یاں جلوہ فرمانہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

مرا نچہ دل ہے وہ دل گرفتہ
کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ ! بیگانگی میں
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

کیا مجھ کو داغوں نے سرو چراغاں
کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا

شب و روز اے درد درپے ہوا اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا، نہ دیکھا

☆.....☆.....☆

مژگان تر ہوں، یا رگ تاک بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں

کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی
افتادہ ہوں پہ سایہ قد کشیدہ ہوں

ہر شام مثل شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثل صبح گریباں دریدہ ہوں

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
پر آہ ! میں تو موج نسیم وزیدہ ہوں

چاہے ہے یہ مری تپش دل کہ بعد مرگ
سنج مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں

اے درد جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غم زدہ تو قطرہ اشک چکیدہ ہوں

☆.....☆.....☆

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینہ کے سامنے جب آکے ہو کریں

تردامنی پہ شیخ، ہماری نہ جائیو !
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سرتا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
منہ پھیرلے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہی اعتبار
کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدان شہر
اے درد آکے بیعت دست سبو کریں

☆.....☆.....☆

سمجھنا مہم گر کچھ ہے طبیعی سے الٰہی کو
شہادت غیب کی خاطر تو حاضر ہے گواہی کو

نہیں ممکن کہ ہم سے ظلمت امکان زائل ہو
چھڑا وے آہ کوئی کیونکہ زنگی سے سیاہی کو

عجب عالم ہے ادھر سے ہمیں ہستی ستاتی ہے
ادھر سے بیستی آتی ہے دوڑی عذر خواہی کو

نہ رہ جائے کہیں تو زاہدا محروم رحمت سے
گنہ گاروں میں سمجھا کر یو اپنی بے گناہی کو

نہ لازم نیستی اس کو نہ ہستی ہی ضروری ہے
بیاں کیا کیجے اے درد ! ممکن کی تباہی کو

☆.....☆.....☆

ہر طرح زمانہ کے ہاتھوں سے ستم دیدہ
گر دل ہوں تو آزردہ، خاطر ہوں تو رنجیدہ

ہم گلشن دوراں میں اے خفتگی طالع !
سرسبز تو ہیں، لیکن جوں سبزہ خوابیدہ

اے شور قیامت ! رہ اودھر ہی، میں کہتا ہوں
چونکے نہ ابھی یاں سے کوئی دل شوریدہ

اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں سے ملا نظریں
ادھر کو نظر کوئی پھینکی بھی تو دزدیدہ

مجھ پر بھی تو یہ عقدہ تو کھول صبا ! بارے
زلفوں نے کسے بھیجا یہ نامہ پیچیدہ

بدخواہ سبھی عالم گو ہو وہے تو ہو ، لیکن
یا رب ! نہ کسی کے ہوں دشمن یہ دل ودیدہ

کرتا ہے جگہ دل میں جوں ابروئے پیوستہ
اے درد یہ تیرا تو ہر مصرع چسپیدہ

☆.....☆.....☆

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری، حرف دوئی کا نہ آسکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیرازفنا مجھے
نقش قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے

قاصد ! نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل ! خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا وے اگر تو بھلا سکے

یا رب ! یہ کیا طلسم ہے اور اک وفہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول
دل سے اٹھا خلاف، اگر تو اٹھا سکے

افشائے راز عشق نہ ہو آب اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

مست شراب عشق وہ بے خود ہے جس کو حشر
اے درد ! چاہے لائے بخود پھر، نہ لا سکے

☆.....☆.....☆

اہل فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوح مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

فارغ ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہان کی
خطرہ جو ہے سو آئینہ دل پہ زنگ ہے

حیرت زدہ نہیں ہے فقط تو ہی آئینہ !
یاں تک بھی جس کی آنکھ کھلی ہے، سو دنگ ہے

اس ہستی خواب سے کیا کام تھا ہمیں
اے نشہ ظہور ! یہ تیری ترنگ ہے

گل گیر ! منہ پسار نہ تو شمع کی طرف
اس کی زبان ہی اسے کام نہنگ ہے

کب ہے دماغ عشق بتان فرنگ کا
مجھ کو تو اپنی ہستی ہی قید فرنگ ہے

عالم سے اختیار کی ہر چیز صلح کل
پر اپنے ساتھ مجھ کو شب و روز جنگ ہے

میں کیا کہوں تجھے نظر آتا نہیں ہے کیا
اس گلشن جہاں کا جو کچھ رنگ ڈھنگ ہے

غنچہ شگفتہ ہووے ہی ہووے کہ اس میں
دیکھا چمن میں جا کے تو بے رنگ بے

☆.....☆.....☆

میں کیہڑی اپنی درداں دی دنیا وچ وساں کی دساں
کس گلے پیاں رورو کے چہرے تے لساں کی دساں
میں ٹریا جنگل بیلے نوں اوہ جبل وریدوں بیہڑے سی
اک پانے والے پایاں سن کجھ پٹھیاں دساں کی دساں
پئی جدوں مصیبت ہو کے تے سب اُکن دکن نس گئے
سنگ کویں تروڑے یاراں نے میں دسنوں نساں کی دساں
او عشق نہیں جو لگ جائے تے گور اریڑے لے جائے
ایہہ چڑیاں ہویاں فیر کدی لتھیاں نئیں کساں، کی دساں
بھن متھے نوں فرہاد لیا پانی دی نہر وگائی نہ
میں جاری کیتیاں خون دیاں اکھاں توں کساں کی دساں
حد اودی جتھوں ٹردی اے مکدی اے حد تصور دی
میں ایویں خام خیالاں دے پیا گھوڑے کساں کی دساں
رنگ کھلا میری وحشت دا ہو کٹھے کجھ ہمدرد گئے
او رورو پچھن حال میرا میں کھڑ کھڑ ہساں کی دساں
کوئی ویکھے میریاں زخماں نوں کوئی پرنے دی تدبیر کرے
کوئی اجیہا سیاناں دسے ناں میں کنوں دساں کی دساں
کیوں فضل سودائی ہویاں اے پلے دیاں لیراں لاہیاں نی
پھڑ لوکی پلا پچھدے نیں میں پلا کھساں کی دساں

منزل تیکر اسین وی ہین تک اڑے ہوئے ہوندے
ساڈے راہ وچ جے نہ اپنے ہتے ہوئے ہوندے
لوکاں ہین تک گھڑ لینی سی ہور اک نوین کہانی
پلکاں تھلے جے نہ اتھرو اساں لکوئے ہوندے

محمد اقبال زخمی

نعت رسولِ مقبولؐ

(خواجہ غلام قطب الدین غزنوی)

ذرے اُس خاک کے تابندہ ستارے ہوں گے
جس جگہ آپؐ نے نعلین اتارے ہوں گے

پھوٹے گل اس پہ بھرتی ہے چھپائے چہرہ
کیسے سرکارِ دوعالمؐ نے سنوارے ہوں گے

اُس طرف بارشِ انوار مسلسل ہو گی
جس طرف چشمِ محمدؐ کے اشارے ہوں گے

ہم بھی پہنچیں گے شہِ ارض و سما کے در پہ
اوج پہ جب بھی کبھی بخت ہمارے ہوں گے

ارضِ طیبہ تجھے دیکھے کوئی بار دیدۂ دل
سُرمہ بن کر شہِ رحمت عالمؐ کے نظارے ہوں گے

ایک میں کیا مرے شاہا شہِ شہنشاہ ہوں گے
تیرے ٹکڑوں پہ شب و روز گزارے ہوں گے

لوگ کچھ حسنِ عمل لے کر چلے روزِ حساب
سرورا ہم تو فقط تیرے سہارے ہوں گے

آنکھ لگی جب تری جانب وہ کرم بار نظر
اُس گھڑی قطب ترے وارے نیارے ہوں گے

پیش:- شہباز احمد
گوجرانوالہ
جرنلسٹ، رائٹر، شاعر

8/10/2012

جو ذرّے ملے مجھ کو مدینے کے سفر میں
چُن چُن کے وہ سب رکھ لیے دامانِ نظر میں

بیٹھا ہوں لیے دردِ محمدؐ کا جگر میں
اللہ کی رحمت سے ہے سب کچھ مرے گھر میں

فردوس کے منظر ہیں نہ وہ نورِ قمر میں
انوار بھرے ہیں جو مدینے کی سحر میں

اڑنے کی نہ طاقت رہی جبریل کے پر میں
ایسا بھی مقام آیا تری راہ گزر میں

دھارے سے برسنے لگے میزابِ کرم کے
جب اشک اُمڈ آئے مرے دیدۂ تر میں

جلوہ ہے مرے سامنے معراجِ دنیٰ کا
اک صاحبِ مازاغ کا سرمہ ہے نظر میں

اک حُسنِ ازل، حُسنِ نظر، حُسنِ حقیقت
دیکھا ہے ترے روضے کی دیوار میں، در میں

میدانِ قیامت میں ہے ایک ایک گنہگار
رحمت کی قسم رحمتِ عالمؐ کی نظر میں

اب چھوڑ دے کشتی کو ہلالؔ اُن کے کرم پر
وہ چاہیں تو ساحل ابھی بن جائے بھنور میں

ہلالؔ جعفری

بدلتی رتوں کا پیغامبر، اسوج کا مہینہ جب راتیں خنک، سحر سہانی اور شامیں مستانی ہو جاتی ہیں۔

گوجرانوالہ (نمائندہ خصوصی) بدلتی رتوں کا پیغامبر، اسوج کا مہینہ، جب راتیں خنک، سحر سہانی اور شامیں مستانی ہو جاتی ہیں، جب پرندے چاند کی روشنی میں دیر اٹھیکیلیاں کرتے نظر آتے ہیں، جب دیہاتوں میں چھتوں اور کھلے صحن میں سونے والے دیسی کپاس سے بنے کھیسوں کی درزوں سے نیلے چاند کو تکتے تکتے اپنے اپنے چاند کی یاد میں کھو جاتے ہیں، جب سبزے پر بہار آ جاتی ہے اور کلیاں کھلنے کو بے قرار ہوتی ہیں۔ جوہڑوں اور بارشوں سے بھرے گڑھوں میں کنول کے پھول اپنی سفیدی کی بہار دکھانے کے لئے بے قرار ہوتے ہیں۔ بھادوں کے حبس بھرے مہینے کے بعد اسوج کا مہینہ شروع ہوتا ہے۔ اس مہینہ میں بارش کم ہوتی ہے اور کبھی کبھار تو یہ بھادوں کی طرح گرم اور حبس بھرا ہی رہتا ہے لیکن اکثر اس مہینہ میں رات کو چلنے والی ہوائیں زندگی بھری اور خوشگوار ہوتی ہیں اور سانس میں تازگی بھرتی جاتی ہیں۔ پنجاب کلچر میں ان ہواؤں کو (گھٹ) کہا جاتا ہے اس مہینہ میں ہونے والی ایک آدھ بارش ہی موسم کا مزاج ایک دم سے بدل دیتی ہے۔ آدھی رات کے بعد اسوج کے مہینہ میں خنکی محسوس ہوتی ہے اور اوس بھی پڑتی ہے کھلے صحن اور چھتوں پر سونے والے چمکتے آسمان پر نیلے چاند کی بھرپور روشنی میں آسمان پر اڑتے پرندوں کی مست اڑانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور چاند میں اپنا اپنا چاند تلاش کرتے کرتے نیند کی گہری وادیوں میں کھو جاتے ہیں۔ مائیں بچوں کو چندہ ماموں کی کہانیاں سناتی ہیں تو کبھی چاند میں چرخہ کاتنے والی بڑی اماں کی داستان، ہجر اور جدائی کا شکار لوگوں کو تو چاند کی سرزمین پر اپنے محبوب کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دیتی ہے اور رات مستانی ہوائیں جدائی کی آگ کو اور بڑھا دیتی ہے جبکہ مادہ پرندے اس مہینہ میں انڈے دیتے ہیں مویشی اور انسان بھی اس میں اگلی نسلوں کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اسوج میں دھوپ نسبتاً پیلی اور سائے لمبے ہوتے ہیں۔ اس مہینہ میں اکثر فصلیں پکنے کو تیار ہوتی ہیں جبکہ موٹے چاولوں کی فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ باسمتی چاول کی فصل کو اس مہینہ کی اوس اور ٹھنڈک بہتر انداز سے پروان چڑھاتی ہے اسوج گرم رہے تو باسمتی کے چاول اچھے نہیں ہوتے اور اگر اسوج ٹھنڈا اور اوس بھرا ہو تو باسمتی کی فصل بھی شاندار چاول صحت منداور خوشبودار ہوتے ہیں اور پکنے میں لمبے ہوتے ہیں ۔ اسوج کے بارے اکھان بھی مشہور ہے اسوج میں پھلوں کے پودوں اور درختوں پر کونپلیں پھوٹنے کے لئے بے قرار ہوتی ہیں تاہم اس مہینہ میں مچھر کی خطرناک قسمیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اوس میں کوئی چیز اوڑے بغیر سونا نہایت خطرناک ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ تیز بخار اور جسم کی ٹوٹ پھوٹ کی صورت میں نکلتا ہے اور بخار کئی کئی دن جان نہیں چھوڑتا۔ اسوج کا مہینہ دن کو اکثر گرم اور رات کو ٹھنڈا ہو جاتا ہے پنجابی اکھان مشہور ہے اسو ماہ نرالے دن دھپاں رات نوں پالے (اسوج کا مہینہ انوکھا ہے دن کو تیز دھوپ ہوتی ہے اور رات کو ٹھنڈ لگتی ہے)۔